اسلامی خلفاء و ملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

حافظ صلاح الدین یوسف
ایڈیٹر "الاعتصام" لاہور

دار الدعوة السلفیہ
شیش محل روڈ
لاہور ۲ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

ذہنی مرعوبیت کی انتہاء

ایک نکتہ داں شخص نے کس قدر سچ کہا کہ :-

" ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر لیا ہے بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مُردوں پہ بھی یورپ کے مُردوں نے فتح پالی ہے۔"

ہر موقع اور ہر محل پر جب شجاعت، ہمّت، غیرت، علم وفن غرض کسی کمال کا ذکر آتا ہے تو اسلامی ناموروں کے بجائے **یورپ** کے ناموروں کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ قوم سے **قومی** حمیت کا مادہ بالکل جاتا رہا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم میں ابتداء سے اخیر تک اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسلاف کے کارناموں سے واقفیت حاصل کی جائے، اس لئے جب خصائل انسانی کا ذکر آتا ہے تو خواہ مخواہ انہی لوگوں کا نام زبان پہ آتا ہے جن کے واقعات کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں اور یہ وہی یورپ کے نامور ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

"اسلامی ریاست کا تصوّر" یہ موضوع آج کل عام ہے جس پر اپنے اور بیگانے دادِ تحقیق دے رہے ہیں۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے بھی اپنے اس تیسرے مذاکرۂ ملّی میں اس موضوع کو منتخب کیا ہے اور اہلِ علم وفکر کو دعوت دی کہ وہ اپنے نتائجِ فکر اس مذاکرے میں پیش کریں۔

عام خیال یہ ہے کہ تصوّرِ ریاستِ اسلامی خاصا مُبہم اور غیر واضح ہے جس کی توضیح وتفسیر عصرِ حاضر کی شدید ضرورت ہے۔ ہمدرد فاونڈیشن نے بھی اسی نقطۂ نظر کے ساتھ اہلِ علم کو دعوتِ غور وفکر دی ہے۔

راقم کو اس نقطۂ نظر سے قدرے اختلاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید زندگی نے جو وُسعت اختیار کرلی ہے اور اس کی وجہ سے جو پھیلاؤ نظمِ حکومت اور کاروبارِ مملکت میں آگیا ہے، اُس کا تصوّر بھی چند صدیوں قبل نہیں کیا جاسکتا تھا، اس لیے نئے نئے اداروں کی تشکیل، ان کی بوقلموں نوعیّتوں اور گوناگوں ذمّہ داریوں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ازبس ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اسلام ایک اَبدی مذہب ہے جسے قیامت تک باقی رہنا ہے۔ اِس لئے اس میں ایسے واضح اُصول موجود ہیں جو ہر دَور کے نت نئے تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیّت رکھتے ہیں اور ان کی روشنی میں جدید دَور کے مسائل اور اس کی

اِسلامی ریاست کی تشکیل کا صحیح طریقہ

اِس لئے اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حکومتی سطح پر ایک ایسا اِدارہ معرضِ وجُود میں آئے جس میں ایک طرف اُونچے درجے کے وہ اہلِ علم شریک ہوں جنہیں قرآن و حدیث کا پورا علم ہو اور فقہ اسلامی میں وہ گہری نظر رکھتے ہوں اور دوسری طرف ایسے جدید تعلیم یافتہ افراد اس میں شامل ہوں جو جدید مسائل کا ادراک اور ان کی پوری تفصیلات کا صحیح علم رکھتے ہوں، قلب و ذہن کے لحاظ سے خالص مسلمان ہوں اور مغربی افکار و تصوّرات سے ان کے دماغ مرعوب اور تہذیب مغرب کی چکاچوند سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اقبال کی زبان میں عُلماء اہلہ مسجد یا ملّائے مکتب نہ ہوں اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات "تہذیب کے فرزند" نہ ہوں۔ ادارے کے لیے وسیع لائبریری کا انتظام کیا جائے جس میں جدید و قدیم تمام ضروری لٹریچر موجود ہو۔ یہ ادارہ ہر اہم مسئلے پر غور کرے اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں اس کا حل پیش کرے۔ یہی ادارہ جدید اداروں کی تشکیل اور ان کی ذمّہ داریوں کی تعیین کرے اور یہی ادارہ اسلامی ریاست کے تصوّر کو اُجاگر کرے کہ اسے کن خطوط پر اُستوار کیا جائے، پارلیمانی نظامِ حکومت زیادہ موزُوں ہے یا صدارتی طرزِ حکومت انتخاب کا طریقِ کار کیا ہو؟ بالغ رائے دہندگی کی بُنیاد پر انتخاب ہو یا مخصوص اہلیّت کے حامل افراد ہی کو ووٹ کا حق حاصل ہو؟ وغیرہ وغیرہ کیونکہ اسلام نے حکومت کے مقاصد اور حکمرانی کے اُصول تو واضح طور پر بتلا دیئے ہیں لیکن حکومت کا کوئی ایک طریقِ کار متعیّن نہیں کیا ہے، اس میں گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ ہر دَور کے مسلمان اپنے احوال و ظروف کے مطابق طرزِ حکومت اختیار کر سکیں حتیٰ کہ اسلام میں شخصی حکومت اور بادشاہی نظام کی ممانعت کی بھی کوئی صریح دلیل موجود نہیں ہے جیسا کہ

آج کل عام لوگ اسے اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں)

موجودہ مسلمان مملکتوں کے حکمرانوں کا طرزِ عمل

لیکن بدقسمتی سے یہ صحیح طریق کار کسی بھی اسلامی ملک میں اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجز سعودی عرب کے کوئی بھی اسلامی ملک اسلام کے نفاذ کے معاملے میں مخلص نہیں ہے۔ اسلامی ملکوں پر جو قیادت مسلّط ہے چاہے وہ فوجی ہے، یا جمہوری، عملاً دونوں سیکولر اور فاشسٹ ذہن کی حامل ہیں۔ سیکولر اس لئے کہ ہر حکمران اور اس کی انتظامیہ اپنے ملک اور معاشرے میں اسلامی تہذیب کی بجائے مغربی تہذیب کو فروغ دے رہی ہے اور مغربی فکر کے مطابق ہی تمام پالیسیاں تشکیل پاتی ہیں حتّٰی کہ تعلیمی پالیسی میں بھی مغربی ذہن ہی کارفرما ہے۔ اس لیے ہماری نوجوان نسل کی اکثریّت اسلامی شعور سے بے بہرہ اور اسلامی تہذیب سے بیگانہ و برگشتہ ہے۔ اور مخلوط تعلیم کی لعنت ہر اسلامی ملک میں موجود ہے اور یہ حکومتیں فاشسٹ اس لیے ہیں کہ طرزِ عمل ان سب کا آمرانہ اور ڈکیٹرانہ ہے۔ مسلمان عوام اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں لیکن ہمارے اسلامی ملکوں کے "مسلمان" حکمران بہ جبر مسلم عوام کو اسلام سے دور لے جا رہے ہیں، عوام کی مرضی اور رائے کے بالکل برعکس اپنی مرضی اور رائے ان پر مسلّط کر رہے ہیں۔ نتیجۃً ہمارے اسلامی ملک بڑی برق رفتاری کے ساتھ اسلامی تہذیب سے بیگانہ ہو رہے ہیں اور مغربی تہذیب کو اپنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں۔ آہ فلیبك علی الاسلام من کان باکیا

اسلام بے چارہ بزبانِ حال کہہ رہا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

البتہ مسلم عوام کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لئے چند ادارے ضرور اس قسم کے بنا رکھے ہیں جن کے نام اسلامی ہیں اور جن کو اسلامی تحقیق کے ادارے باور کرایا جاتا ہے جیسے ہمارے ملک میں "اسلامی تحقیقاتی ادارہ" ہے۔ ایک اسلامی نظریہ کونسل ہے، شرعی عدالتیں ہیں، وزارتِ اُمورِ مذہبی ہے اور وزارتِ حج و اوقاف ہے۔ ان پر بلا مبالغہ لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے لیکن فائدہ ان کا ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کا آئینہ دار ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ان اداروں میں کام کرنے والے عُلماء علمی و تحقیقی صلاحیتوں کے حامل نہیں ہیں بعض ادارے بلا شُبہ خالص علمی و تحقیقی کام کے لئے وقف ہیں، ان سے وابستہ اہلِ علم و فکر بھی ملک کی ممتاز اور نہایت برگزیدہ شخصیتیں ہیں۔ میری گفتگو کا اصل مقصد اور مدّعا یہ ہے کہ حکومت ان اداروں کے قیام میں مُخلص نہیں ہے اس لئے ان اداروں کے ذریعے سے اگرچہ اسلامی موضوعات پر مختلف تحقیقی کام سرانجام پا رہے ہیں لیکن اسلامی نظام کے قیام کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے جیسا کہ ان اداروں کے قیام کا مقصد یہی کچھ بتلایا جاتا ہے۔ اِس لئے وہ خلا بدستور موجود ہے جس کا ذکر راقم کر رہا ہے۔ ہر حکومت کا مقصد محض وقت گزاری اور اپنے اقتدار کی مُدّت کو طویل سے طویل تر کرنے کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ ع

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

کے مطابق ہر آنے والا حکمران پچھلی کوششوں پر خطِ تنسیخ پھیر کر نئے سرے سے اپنی کوششوں کا آغاز کرتا ہے، نئے اداروں کا قیام عمل میں لاتا ہے یا پُرانے اداروں میں نئی رُوح پھونکنے کا عزم ظاہر کرتا ہے، نئے نئے کمیشن بٹھاتا ہے۔ اور بُلند بانگ دعاوی سے ملک و قوم کا نقشہ بدل ڈالنے کی نوید سُناتا ہے لیکن کچھ

عرصہ گذرنے پر، تمام تر دعاوی کے باوجود اور بہت کچھ اتھل پتھل کرنے کے باوصف، معلوم ہوتا ہے ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

حضراتِ محترم! میری اس تلخ نوائی پر شاید کچھ جبینیں شکن آلود ہو جائیں، کچھ چہرے خشمگیں ہوں اور بعض دلوں کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچے لیکن ۳۶ سال سے شب و روز جو تماشہ ہمارے سامنے ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر میں اس تلخ نوائی پر مجبور ہوں کہ ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

اس لیے مجھے اُمید ہے کہ آپ اس تلخ نوائی پر کبیدہ خاطر نہ ہوں گے بلکہ اس تلخی کے پیچھے ملک و ملّت کی اصلاح کا جو جذبہ اور درد کارفرما ہے، اس پر نظر رکھیں گے بقول علامہ اقبال رح

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

بہرحال عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جو صحیح طریق کار تھا، اسے مسلمان مملکتوں کی قیادت اپنانے کے لیے تیار نہیں، البتہ بطور "شوپیس" انہوں نے چند ادارے اسلام کے نام پر ضرور قائم کر رکھے ہیں لیکن ان اداروں کی ساری کوششیں اور کاوشیں ایک مشورے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ سارے اختیارات ہیئتِ حاکمہ اور اس کے چند چہیتے بیوروکریٹوں کے پاس ہیں، وہ اسلامی اداروں کی رائے کو بالکل نظرانداز کر دیں یا ان کا حلیہ بگاڑ کر انہیں نافذ کریں، انہیں اختیار ہے اور عملاً یہی ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی نظریاتی کونسل ایک مسودۂ قانون

اسلامی نقطۂ نظر سے مرتّب کر کے حکومت کو بھیجتی ہے تو وزارتِ قانون کے بزرجمہر یا مشیرانِ خصوصی نام کی مخلوق یا دیگر متعلقہ افسرانِ مجاز اس اسلامی قانون کے مسودے کو سرد خانے کی نظر کر دیں یا اس میں حک و اضافہ کر کے اس کی اسلامی صورت ہی بدل ڈالیں۔ الغرض اس کے ساتھ جو حشر چاہیں کریں، وہ کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی بہت سی اہم اسلامی سفارشات بلکہ تمام ہی سفارشات اور مسودہ ہائے قانون کا یہی حشر ہوا ہے۔ آہ ؎

اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

حکمرانوں کی اس مخصوص پالیسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ تأثر پھیل رہا ہے کہ اسلام اس دور میں شاید قابلِ عمل ہی نہیں ہے۔ اور وہ اس دور کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی نظام کی ترتیب و تدوین کے عنوان پر لمبے چوڑے اداروں کے قیام کے باوجود جب ۳۶ سال کے طویل عرصے میں ایک بھی اسلامی قانون کا نفاذ صحیح معنوں میں عمل میں نہ آسکے تو مذکورہ تأثر کا پھیلنا حیرت و استعجاب کا باعث نہیں ہو سکتا۔

آمدم بر سرِ مطلب

یہ تو تھا ہمارے حکمرانوں کا طرزِ عمل اور اس کے نتائج، جو غیر ارادی طور پہ زبانِ قلم پہ آ گئے اور یہ ذکر

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کے تحت کچھ طول بھی پکڑ گیا کہ اپنے افسانۂ درد میں بھی ایک گونہ لذّت ہوتی ہے

[illegible] ہیں کہ مجبور ہیں ہم

بعض مفکّرین کی خامیاں اور کوتاہیاں

ورنہ راقم نے اس مذاکرے کے لیے ایک اور موضوع کا انتخاب کیا تھا اور وہ ہے موضوعِ مذاکرہ سے متعلق اسلامی مفکّرین کی بعض خامیاں اور کوتاہیاں اور اسلامی خلفاء و ملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ۔

اسلامی ریاست کے موضوع پر عربی اور اُردو دونوں زبانوں میں خاصا کام ہُوا ہے اور متعدّد کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں جن سے اس موضوع کے اہم گوشے بے نقاب ہُوئے ہیں جن اہلِ علم و فکر نے اس موضوع کو اپنایا اور اپنے نتائجِ فکر پیش کیے ہیں ان کی کوششیں بلاشبہ قابلِ صد تحسین ہیں اور ان کی گراں قدر تالیفات علم و تحقیق کا بیش قیمت سرمایہ ہیں تاہم ان مفکّرین کی ان تحقیقی کاوشوں میں بعض خامیاں اور کوتاہیاں بالعموم پائی جاتی ہیں۔ اِلاّ مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہ تعالیٰ

راقم کے خیال میں ان کی وضاحت اس لیے ضروری ہے تاکہ آئیندہ ان کا اعادہ نہ کیا جائے اور ان سے دامن بچا کر موضوعِ زیرِ بحث کو مزید منقّح و مہذب کیا جائے۔ یہ فکری خامیاں حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ موجودہ دور کے مفکّرین کی اکثریّت کے نزدیک ملوکیّت اور بادشاہت بجائے خود مذموم ہے اور اسلام میں کسی صورت اس کی گنجائش نہیں۔

۲۔ اسی لیے خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ماسوا تمام خُلفاء و سلاطینِ اسلام سے یہ حضرات اہلِ علم خُوش نہیں اور ان کا تذکرہ سخت ناگوار انداز میں کرتے ہیں اور ان کے ادوارِ حکومت کا سرشتہ خلافتِ اسلامیہ سے کاٹ کر انہیں خالص دُنیوی اور جاہلی حکومتیں باور کراتے ہیں۔

۳۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام میں بگاڑ کا واحد سبب ملوکیّت کو قرار

قرار دیتے ہیں۔ گویا ملوکیت ان کے نزدیک منبع فساد ہے۔

۴۔ اور مغربی جمہوریت کو ایک آئیڈیل نظام حکومت تصور کرتے ہیں اور اسے ہی واحد اسلامی نظام حکومت باور کراتے ہیں۔

یہ چار چیزیں قدرِ مشترک کے طور پر ان کی اکثریت میں پائی جاتی ہیں جو راقم کے خیال میں ایک طرح کی فکری خامیاں ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے ان کی ضروری تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

خلافت و ملوکیّت

اسلام کا نظامِ حکومت کیا ہے؟ اس کے خدّوخال اور اس کی صورت و نوعیّت کیا ہے؟ یہ آج کل ایک عام سوال ہے جس کے ضمن میں خلافت اور اس کی خصوصیات بھی زیرِ بحث آتی ہیں، بادشاہت اور اس کی مبیّنہ خرابیوں کا تذکرہ بھی ہوتا ہے اور اس کی خوبیوں کا بیان بھی ہوتا ہے۔

ان میں اسلام کا اصل سیاسی نظام کونسا ہے؟ اس کا صاف جواب تو یہی ہے کہ خلفائے راشدین نے جن خطوط پہ سیاسی نظام کو استوار کیا اور ان کے طرزِ حکمرانی نے جو بے لوث اور بے داغ کردار پیش کیا، وہ ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسلام کے نظامِ سیاست اور اس کے طرزِ حکمرانی کا۔ مثلاً

- خلفائے راشدین بیشتر حالات میں ایسے اہم معاملات میں جہاں نصِّ شرعی نہ ہوتی، قوم کے اہل الرائے سے مشورہ لیتے جس سے خلافت کی یہ خصوصیت معلوم ہوئی کہ وہ ایک شورائی حکومت تھی۔
- بیت المال کو وہ ایک امانت سمجھتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ناجائز طور پر قومی خزانے سے نہ کچھ خرچ کرتے تھے نہ اس کے لیے وصول کرتے تھے۔ اپنے ذاتی یا سیاسی اغراض کے لیے بیت المال سے خرچ کرنے کا کوئی تصوّر ان کے اندر نہیں تھا جس سے خلافت کی یہ خصوصیّت معلوم ہوئی کہ قومی خزانہ خدا دخلق کی ایک امانت ہے جس میں حکمران کو بھی اپنے من مانے طریقے سے خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔
- انہوں نے حکمران ہونے کے باوجود اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھا۔

شخص کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر خلیفہ کی طرف سے کسی پر زیادتی ہوئی ہے تو وہ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر سکے اس سے کوئی خلافِ قانون حرکت سرزد ہوئی ہے تو اس سے باز پرس کر سکے، جس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نظامِ خلافت میں حکمرانِ اعلیٰ بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے، اسلامی احکام کی پابندی اور ملکی قوانین کا احترام اس کے لئے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ایک عام مسلمان اور ملک کے عام باشندے کے لئے ضروری ہے۔

● خلفاء نے اپنے کو تنقید سے بھی بالاتر نہیں سمجھا اور اظہارِ رائے پر قدغن نہیں لگائی۔ وہ پانچوں وقت خود عام لوگوں کی امامت کراتے اور جمعہ وعیدین کے موقعے پر لوگوں سے براہِ راست خطاب فرماتے۔ یوں ہر شخص کے لیے ان پر تنقید کرنا اور ان کو روکنا ٹوکنا ممکن اور آسان تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ حکمرانوں کا عوام کی دسترس سے بالا رہنا یا انہیں اظہارِ رائے سے محروم رکھنا یہ اسلام کے نظامِ خلافت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

● خلفاء نے اپنے کو قبیلہ وخاندان اور نسل ووطن کی عصبیتوں سے بھی پاک رکھا جس کی اسلام نے بڑی تاکید کی ہے حتیٰ کہ احتیاطاً اپنے اہل وعیال کو وہ مراعات تک بھی نہ دیں جو عام لوگوں کو انہوں نے مہیا کیں۔ تاکہ ان پر کسی بھی قسم کی جنبہ داری یا خویش نوازی کا الزام عائد نہ ہو سکے، جس سے معلوم ہوا کہ اسلامی خلافت، قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں اور دیگر اس قسم کی آلائشوں سے پاک ہوتی ہے۔

● خلفائے راشدین نے اپنا معیارِ زندگی بالکل سادہ رکھا، خوراک کا خرچ عام لوگوں سے بھی کم، لباس بالکل سستا اور وہ بھی پیوند لگا۔ نہ صدارتی محل نہ زرنگار ایوانِ حکومت، نہ باڈی گارڈز کا طنطنہ نہ شاہانہ کروفر کا ہمہمہ اور نہ خدم وحشم کا لاؤلشکر۔ جس سے خلافت کی یہ خصوصیت معلوم ہوئی کہ وہ انتہائی سادہ نظام ہے

جس میں تکلفات و آرائش کی کم سے کم گنجائش ہے۔

یہ تھیں خلافت کی وہ خصوصیات جو خلفائے راشدین کے طرز عمل سے مستفاد ہیں جن کی بنیاد دراصل وہ اصول و مقاصد ہیں جو اسلام نے حکمرانی اور اسلامی ریاست کے لئے متعین کئے ہیں، مثلاً حاکمیت خداوندی، عدل بین الناس، مساوات بین المسلمین، اطاعت فی المعروف و نہی عن المنکر اور نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا قیام وغیرہ اس کے مقابلے میں "ملوکیت" کا لفظ ہے جس کو خلافت کے متضاد سمجھا گیا ہے۔ بلاشبہ اسلام سے پہلے جو بادشاہتیں قائم تھیں یا اس کے بعد بھی جو غیر مسلم قوموں میں قائم رہیں، وہ خلافتِ اسلامیہ کی خصوصیت کے برعکس تھیں۔ اُن میں بادشاہ مطلق العنان حکمران ہوتا تھا اور قانون سے بالاتر۔ حاکمیت خداوندی کا کوئی تصوّر ان کے اندر موجود نہیں تھا۔ بیت المال کے امانت ہونے کا تصوّر نہیں تھا بلکہ رعیت بادشاہ کی باجگزار سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہوں کا رہن سہن اور طرز بود و باش سادگی کی بجائے انتہائی رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ اور شاہانہ طمطراق پر مبنی تھا۔ بادشاہ عوام پر جو ظلم و ستم چاہتے کرتے، کوئی داد فریاد اور استغاثے کی صورت نہ ہوتی، وہ تنقید سے بالاتر سمجھے جاتے تھے، کوئی ان کو روکنے ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

"ملوکیت" یا "بادشاہت" اس مفہوم میں یقیناً خلافت کی ضد ہے۔ جس کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ لیکن اصل مسئلہ تاریخِ اسلام یا اسلامی خلفاء و سلاطین کا اور اُن اسلامی بادشاہتوں کا ہے جو مختلف ادوار میں اسلامی قلمرو میں قائم رہیں۔ آیا یہ بادشاہتیں بھی اسی انداز کی تھیں جس کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے؟ اور کیا یہ بادشاہتیں بھی اسلامی خلافت کی خصوصیات سے بالکل تہی دامن تھیں؟۔

ہمارے دور کے اکثر مفکّرین تو اس کا کھٹ سے یہی جواب دیتے ہیں کہ ہاں

یہ بادشاہتیں بھی ویسی ہی تھیں جو اسلام میں پسندیدہ نہیں۔ نیز یہ کہ خلافت کی خصوصیات سے بھی یہ بادشاہتیں بالکل عاری تھیں بلکہ بعض مفکرین نے تو ان کو جاہلی حکومت تک سے تعبیر کیا ہے۔

میں بصد ادب گزارش کرونگا کہ اسلامی بادشاہوں کے بارے میں اور اسلامی تاریخ سے متعلق یہ نقطۂ نظر تصحیح اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اسلامی بادشاہتوں کا آغاز ۳۰ سالہ خلافت راشدہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت سے کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی تک قائم رہتا ہے ۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال پاشا نے الغائے خلافت کا اقدام کر کے اسلامی بادشاہتوں کا یہ سلسلہ ختم کیا۔ گویا تیرہ صدیوں سے زیادہ اسلامی بادشاہتوں کا یہ سلسلہ پوری اسلامی قلمرو میں بلا کسی ادنیٰ اختلاف کے جاری رہا جس میں کم و بیش دو سو سال کا (خلافتِ راشدہ کے بعد) وہ عرصہ بھی شامل ہے جس کو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ دور کتاب "تبع تابعین" جلد اول کے فاضل مؤلف مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی کے قول کے مطابق عباسی خلیفہ متوکل کے دورِ خلافت تک محیط ہے جس کا قتل ۲۴۷ھ کو ہوا۔ گویا اسلامی بادشاہتوں کے ابتدائی دو سو برس صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے عہدِ زریں میں گزرے اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کا یہ دور زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے خیر القرون ہے خیر القرون

قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔ الحدیث

یہ قرون ثلثہ مشھود لھا بالخیر اسلام کا عہدِ زریں ہے جس میں صحابہ کرام کا دور بالخصوص ہمارے لئے قندیلِ ہدایت اور مینارۂ نور ہے اور اس کے بعد تابعین و تبع تابعین کا عہدِ سعادت مہد بھی علم و عمل کی تابانیوں سے معمور اور سیرت و کردار کی رفعتوں اور عظمتوں کا آئینہ دار ہے۔ صحابہ و تابعین کے دور میں ہوئی حکمرانوں

کو ان کی غلط روِیوں پر صحابہؓ و تابعین نے ٹوکا اور بلا خوف لومۃ لائم حق گوئی کا فریضہ ادا کیا تبع تابعین کے دور میں خلافت عباسیہ میں ائمہ دین اور علمائے امت نے دین حق کی پاسبانی کا حق پوری جرأت و ہمت سے ادا کیا۔ اسی دور میں فتنۂ اعتزال نے جنم لیا، فتنۂ خلقِ قرآن حشر بداماں بن کر سامنے آیا اور مسئلہ طلاق مکرہ نے علماء کے لیے دار و رسن کے اسباب مہیا کئے۔ ان فتنوں کے پشت پناہ خود عباسی خلفاء تھے، اختیار و اقتدار ان کے پشتیبان تھے لیکن دنیا جانتی ہے کہ امام احمدؒ نے اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فتنۂ خلقِ قرآن کا پوری جرأتِ ایمانی سے مقابلہ کیا، اختیار و اقتدار کی قہرمانی کو قطعاً خاطر میں نہ لائے۔ اور قید و بند کی تمام صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ امام مالکؒ نے طلاق مکرہ کے مسئلے پر خلیفۂ وقت سے ٹکر لی حتیٰ کہ ان کا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کرا کے ان کی تذلیل و اہانت کا ڈرامہ سر بازار رچایا گیا اور ان کی مشکیں کس دیں گئیں لیکن اس حالت میں بھی وہ اعلانِ حق اور مسئلے کی صحیح وضاحت سے باز نہ آئے۔ اور اس طرح کی متعدد مثالیں اور واقعات ہیں جن میں علمائے حق نے خلفائے وقت کو ٹوکا، ان پر سخت تنقیدیں کیں اور ان کی غلط رویوں کی اصلاح کی۔

اب یہ بات کیسی عجیب ہے کہ پوری تیرہ صدیاں اسلامی قلمرو میں بادشاہتیں قائم رہیں لیکن عہدِ خیر القرون سمیت کسی بھی دور میں علمائے امت نے اسے نشانۂ تنقید اور ہدفِ ملامت نہیں بنایا۔ دراں حالیکہ تنقید اور حق گوئی کا فریضہ انھوں نے خطرناک سے خطرناک حالات میں بھی ادا کیا ہے۔ کئی مسائل میں براہِ راست خلفائے وقت سے تصادم مول لیا۔ اُن سے لڑ گئے اور بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں لیکن حق سے انحراف اور حق گوئی سے دست برداری کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ہزاروں نہیں، لاکھوں کی تعداد میں علمائے حق گزرے ہیں۔ ان کی موجودگی میں یہ بادشاہی نظام قائم رہا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں ایسا ہوا، تابعین کے دور

میں ہُوا۔ تبع تابعین کے دَور میں فقہا، و مُحدّثین کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ جنہوں نے جان پر کھیل کر اسلام کی حفاظت کی۔ سب کے سامنے خلفاء مرتے رہے اور ان کی جگہ ان ہی کے بیٹے یا قریبی رشتہ دار منصب خلافت پر فائز ہوتے رہے۔ یعنی بادشاہی نظام عہد بہ عہد قائم رہا لیکن کسی عالم، امام، محدّث، فقیہ اور مدبّر و مفکّر کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی وہ کہتا کہ یہ نظام صحیح نہیں ہے، اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

ہمارے پاس اس اَمر کے لئے کوئی معقول دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ اور تمام مسائل میں ہمیشہ عُلمائے حق نے لاگ لپیٹ کے بغیر دو ٹوک طریقے سے حق گوئی کا فریضہ ادا کیا لیکن صرف اسی ایک مسئلے میں ان کی جُراتیں اور ہمتّیں جواب دے گئی تھیں اور ان کی زبانوں کو تالے لگ گئے تھے۔ ہم تو ان کے طرزِ عمل سے یہی سمجھیں گے کہ ان کی نظر میں فی نفسہ بادشاہی نظام اور طریقۂ ولی عہدی میں کوئی خرابی یا قباحت ایسی نہ تھی جس سے اسلام کا کوئی تقاضا مجروح و پامال ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور اس کی بھی اُسی طرح وضاحت کرتے جس طرح وہ اس طریقے سے برسرِ اقتدار آنے والے خُلفاء و ملوک کی غلط رویوں کی وضاحت کرتے رہے۔ دنیا کا کوئی خوف یا لالچ ان کو اس سے نہ روک سکا۔ رحمۃ اللہ و رضوانہ علیہم اجمعین

قیصریّت وکسرویّت

اس سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ یہ شاہی نظام قیصر وکسریٰ کا ورثہ ہے، اس لیے یہ قیصریت وکسرویّت ہے جس سے اجتناب کی ضرورت ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ ایسے افعال جو فی نفسہٖ جائز و مباح ہوں اور ان کا رواج غیر مسلموں میں بھی ہو، شریعت کی کسی نصّ سے یہ ثابت نہیں کہ محض اس بنا پر ان کا ارتکاب مسلمانوں کے لئے حرام ہو جائے۔ مثال کے طور پر آج کل بیلٹ بکس کے ذریعے خُفیہ ووٹنگ ہوتی ہے۔ یہ خالص اُن غیر مُسلم قوموں کا فعل ہے جو قیصر وکسرےٰ کی وارث وجانشین ہیں۔ اگر کسی اسلامی مملکت میں بھی انتخاب کا یہی طریقِ کار اختیار کر لیا جائے تو یہ فعل جب بجائے خود اپنے اندر ایسی قباحت نہیں رکھتا کہ جس کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا جائے تو یہ کوئی معقول دلیل نہیں ہو گی کہ اس طریقِ انتخاب کو محض اس بنا پر ناجائز قرار دے دیا جائے کہ یہ خالص کافر قوموں کا طرز اور شعار ہے اور یہ کہ خُلفائے راشدین اس طریقے سے منتخب نہیں کئے گئے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عُمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شاہانہ شان وشوکت میں دیکھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اَکِسْرَوِیَّۃٌ یَا مُعَاوِیَۃُ؟ "معاویہؓ کیا تم نے کسرویّت اختیار کر لی ہے؟" حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ "ہم ایسی سرحد پر ہیں جہاں ہر وقت دشمن کا سامنا رہتا ہے، پس اگر اس طرح نہ کروں تو وہ ہمیں کمزور سمجھیں گے، پس ان پر اس طرح رُعب ڈالے رکھتا ہوں اس میں اسلام ہی کی عزّت و سربلندی ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں اُسے ترک کر دینا

ہوں" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"جب بھی میں نے تم سے کسی ایسی بات پر بحث کی ہے جس سے تم پر حرف گیری کا پہلو نکلتا ہو، تو تمہاری وضاحت کے بعد میرا حال ایسا ہو جاتا ہے کہ میں یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ میں تمہیں اسی طرح کرنے دوں یا اس سے روک دوں" (تاریخ الطبری، ج ۵، ص ۳۳۱، طبع جدید۔ البدایۃ والنہایۃ، ج ۸، ص ۱۲۴، ۱۲۵۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۳۶۰)

علامہ ابن خلدون نے حضرت عمرؓ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا عمدہ بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ، معاویہؓ کے جواب میں خاموش ہو گئے اور انہیں غلط کار نہیں ٹھہرایا کیونکہ حضرت معاویہؓ کا ایسا کرنے سے وہی مقصد تھا جو مذہب کا ہے۔ اگر حضرت عمرؓ کا مقصد سرے سے بادشاہی کا انکار ہوتا تو وہ حضرت معاویہؓ کے جواب میں اس کو صرف "کسرویت" سے تعبیر یا اس کی طرف انتساب کر کے خاموش نہ ہو جاتے بلکہ وہ معاویہ کو بالکلیہ اس کے ترک کرنے کا حکم دیتے۔ گویا اوّلاً حضرت عمرؓ نے "کسرویت" سے وہی مفہوم اخذ کیا جو اس عنوان سے اہل فارس اپنے ملک میں ظلم و عدوان، باطل پرستی اور خدا سے اعراض و تغافل کر رہے تھے لیکن حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ ان کا مقصد اہل فارس کی "کسرویت" اور ان کی باطل پرستی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی ان کا اصل مقصد خدا کی رضامندی ہی ہے۔ اس جواب پر حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے اسی طرح تمام صحابہؓ کی شان تھی کہ وہ بادشاہی سے اس بناء پر گریز کرتے

فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک ۔ ص ۳۶۰)

بہرحال مقصد اس تفصیل سے یہ ہے کہ عمر فاروقؓ جیسے شخص نے حضرت معاویہؓ کی "کسرویّت" کو محمود قرار دیا کیونکہ اس سے ان کا مقصد فی الواقع کسرویّت کی پیروی نہ تھی بلکہ اس سے بھی ان کا اصل مقصد دینِ اسلام کی سربلندی، خدا کی رضا اور مسلمانوں کی خدمت ہی تھی۔ اگر فی نفسہٖ اس میں کوئی قباحت ہوتی تو حضرت عمر فاروقؓ جیسا سخت گیر حاکم اس پر سکوت اختیار نہ کرسکتا تھا۔ بالکل اسی طرح اقدامِ ولی عہدی اور بادشاہی نظام جب وہ بجائے خود اپنے اندر حرمت کی کوئی وجہ نہیں رکھتا تو اُسے ناجائز کہنا بھی کیونکر معقول طریقہ ہوسکتا ہے۔

علامہ ابن خلدون ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

"بادشاہت ان کے نزدیک اُسی طرح جائز تھی جس طرح مال و دولت کا جمع کرنا اس وقت جائز ہے، جب اس میں اسراف و تبذیر سے احتراز کیا جائے۔ بادشاہت اور غلبے کو اُنہوں نے ناجائز اُمور و باطل میں صرف نہیں کیا اور نہ اس کی وجہ سے وہ دیانت اور حق کے مقاصد سے روگردانی کے مرتکب ہُوئے ۔۔۔۔ بادشاہت حاصل ہو جانے کے بعد اس کا استعمال صحیح صحیح اور راہِ حق میں کیا جائے تو وہ قابلِ نکیر نہیں۔ حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام بنی اسرائیل کے بادشاہ ہی تھے، اس کے باوجود وہ راہِ حق پر گامزن اور نبوّت سے سرفراز تھے ۔۔۔۔۔"

اسی طرح حضرت معاویہؓ اور یزید کے بعد مروان بن الحکم اور ان کے صاحبزادے عبدالملک، یہ بھی اگرچہ "بادشاہ" تھے لیکن ان کی بادشاہت وہ نہ تھی جو سرکش اور برخود غلط لوگوں کی ہوتی ہے۔ مقاصدِ حق ہمیشہ

ان کے پیشِ نظر رہے اور ان سے انہوں نے انحراف نہیں کیا۔ بعض
دفعہ جو ایسی صورت پیدا ہوئی، اس کی وجہ ان کا یہ مقصد تھا کہ افتراق سے
اُمّت کو بچایا اور اتّحاد کو قائم رکھا جائے۔ یہ مقصد ان کے نزدیک
دیگر سب مقاصد سے اہم تھا۔

ہمارے اس دعوے کے ثبوت میں ان کا جذبۂ اتّباعِ رسُول اور آپ ﷺ کی
اقتداء کے واقعات نیز ان کے جو حالات و مقاصد عُلمائے سلف و خلف نے
بیان کئے ہیں، کافی شاہد ہیں۔ امام مالکؒ اپنی کتاب "المؤطا" میں عبدالملک بن مروان
کے طرزِ عمل کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں۔ مروان تابعین کے طبقۂ اُولیٰ میں سے ہیں
اور ان کی عدالت معروف ہے۔ پھر یہ خلافت خلیفہ عبدالملک کی اولاد کی طرف
منتقل ہو گئی۔ وہ بھی دین کے لحاظ سے اُونچے مقام پر فائز تھے۔ ان ہی میں سے
عُمر بن عبدالعزیزؒ ہوئے، جنہوں نے اپنی طاقت کے مطابق پہلے خُلفائے اربعہ
اور صحابہؓ کے طریقے پر چلنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد پھر ایسے بادشاہ ہوئے
جنہوں نے "بادشاہت" کو دُنیوی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کیا اور اپنے
سلف کے اُس منہاج کو اُنہوں نے چھوڑ دیا جو اُنہیں ہر وقت حق سے اور اعتدال
سے متجاوز نہ ہونے دیتا تھا۔ ان کے اس کردار نے ان کو لوگوں کی نظروں سے گرا دیا۔
اور بادشاہت کو عباسیوں کی طرف منتقل کر دیا۔

نیز عباسیوں میں بھی بہت سے ایسے بادشاہ ہوئے جنہیں عدالت میں
ایک خاص مقام حاصل تھا، انہوں نے بھی بادشاہت کو حسبِ استطاعت صحیح صحیح
استعمال کیا اور اس کا رُخ حق کی طرف موڑ دیا۔ ان کے بعد بنوالرشید سریر آرائے

کیا اور دُنیا اور باطل اُمور میں منہمک ہو گئے اور دین کو پسِ پشت ڈال دیا، جس کی سزا اللہ نے اُنہیں یہ دی کہ خلافت کو عربوں سے چھین کر دوسروں کو دیدیا۔ واللہ لا یظلم مثقال ذرۃ (مقدمہ ابن خلدون فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک)

ایک مصری فاضل علامہ مُحبّ الدین الخطیب، حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"خلافت، بادشاہت اور امارت یہ اصطلاحی عنوانات ہیں، جن کی اصل کیفیت ان کے مدلول کے طرزِ عمل سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ آدمی کی سیرت اور اس کا طرزِ عمل ہی ہمیشہ مُعتبر ہوتا ہے۔ حضرت معاویہؓ مسلسل ۲۰ سال خلافتِ راشدہ میں شام کے گورنر رہے پھر بیعتِ حسنؓ کے بعد ۲۰ سال پُوری اسلامی قلمرو کے خلیفہ رہے۔ دونوں حالتوں میں اُنہوں نے عدل و انصاف کے عَلَم کو سربلند رکھا۔ تمام طبقات کے ساتھ نیک سلوک ان کا مقصد اور شرفاء کی تکریم اور جُہلاء سے عفو و درگزر ان کا شیوہ رہا۔ تمام اُمور میں پُورے حزم و احتیاط اور ایمان و استقامت کے ساتھ شریعتِ محمدیہ کے احکام کی پابندی کرتے، لوگوں کو نماز خود پڑھاتے، ان کی مجالس و محافل میں شریک ہوتے اور جنگ کے موقعے پر خود ان کی قیادت کرتے.....

جو شخص بھی حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی پر غور کرے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ شام میں ان کی حکومت عدل و انصاف، باھم رحم و شفقت اور ہمدردی و اخوت کے لحاظ سے بے مثال تھی۔ چالیس سال تک جس نے اس طرح مسلمانوں کی خدمت کی ہو۔ اور اس دوران میں مسلمان بھی ان سے خوش رہے ہوں، وہ بلاشک خلیفہ ہے۔ اور جو

شخص انہیں "بادشاہ" کہنے پر مُصر ہو، وہ بھی اس حقیقت سے انکار کی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ تمام اسلامی بادشاہوں میں سب سے زیادہ رحمدل اور صالح ترین تھے ...."

اس کے بعد علامہ محب الدین الخطیب نے علماء و محدثین کے کتب تواریخ سے وہ تبصرے نقل کئے ہیں جو انہوں نے حضرت معاویہؓ کی سیرت و کردار کے متعلق کئے ہیں۔ انہیں نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں۔

"یہ مثالیں ہم نے اس لیے ذکر کی ہیں تاکہ لوگ یہ جان لیں کہ معاویہؓ کی حقیقی صورت اس جھوٹی صورت سے کس قدر مختلف ہے جس کی تصویر کشی حضرت معاویہؓ کے دشمن اور اسلام کے دشمن کرتے ہیں، اس کے بعد ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ معاویہؓ کو خلیفہ اور امیر المومنین کہے یا ان کے ساتھ اس لقب میں بخل برتے۔ معاویہؓ اپنے عدل، حلم، جہاد اور عملِ صالح کی فردِ عمل لے کر خدا کے حضور جا چکے، وہ ہماری دنیا کی اس بحث سے بے نیاز ہیں کہ انہیں خلیفہ سے ملقب کیا جائے یا بادشاہ سے۔ وہ اپنی آخرت میں اس چیز سے کہیں زیادہ بے رغبت ہوں گے۔ جتنے وہ اپنی دنیوی زندگی میں پہلے رہے ہوں گے" (تعلیقات "العواصم من القواصم" ص ۲۰۷-۲۱۰ طبع مصر)

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ سمیت تمام اسلامی خلفاء و ملوک کے بارے میں آج کل یہ پروپیگنڈہ عام ہے اور جس کو ہمارے دور کے مفکرین نے آب و دانہ مہیا کیا ہے کہ وہ شریعت سے بالکل بے پروا اور دنیوی و ذاتی اغراض و مفادات کے اسیر تھے اور یہ کہ ان کی حکومتیں اسلامی حکومت کی تمام خصوصیات سے عاری تھیں، اس کا ازالہ کیا جائے۔ ہمارے ان مفکرین کو اسلامی بادشاہوں میں سوائے خرابی کے اور کوئی بات نظر نہیں آتی، ان کی خوبیاں اور کارنامے ان کو نظر ہی نہیں آتے۔ بقول علامہ شبلی ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

لیکن میں عرض کروں گا کہ اسلامی بادشاہوں کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ بہت سے بادشاہ اور حکمراں غلط کردار کے حامل بھی ہوئے ہیں لیکن میں یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد سوائے حضرت عُمر بن عبدالعزیز کے حضرت معاویہؓ سمیت تمام خُلفاء و ملوک اسلامی کردار سے عاری تھے اور اُن کی حکومتیں نعوذ باللہ جاہلی حکومتیں تھیں یا وہ ایسی مطلق العنان بادشاہتیں تھیں جو اسلام میں ناپسندیدہ ہیں۔ میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں، دلائل و حقائق کی روشنی میں کہتا ہوں، محض عقیدت کی بنیاد پر نہیں، واقعات کی رُو سے کہتا ہوں کہ یہ عظیم ترین بُہتان ہے، یہ تاریخ کا بدترین جھوٹ ہے اور یہ وہ ظلمِ عظیم ہے جو اپنوں ہی نے اپنوں کے ساتھ کیا ہے۔ بقول حفیظ جالندھری مرحُوم ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اور ستم ظریفی کی انتہاء یہ ہے کہ اس غلط دعوے کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے تاریخ پر اس طرح ظلم کیا ہے کہ رائی کو پربت بنایا۔ تِل کو پہاڑ ثابت کیا۔ جُزئی کو کُلّیہ بنا ڈالا، اس سے بھی کام نہ چلا تو شوقِ الزام تراشی میں زیب داستان کے طور پر اپنی طرف سے کئی چیزوں کا اضافہ کر ڈالا اور دوسرا طرفہ تماشہ کیا کہ وہ تمام مواد انہوں نے نظر انداز کر دیا جو اُن کے رُخِ روشن کی نقاب کشائی کرتا ہے ان کے کردار کی عظمت کو نمایاں کرتا اور ان کے اسلامی تشخّص کو واضح کرتا ہے۔ آہ کسی نے کیا خُوب کہا ہے ؎

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی گزشتہ چودہ صدیوں میں اچھے اور بُرے دونوں قسم کے حکمراں گزرے ہیں۔ اگر کچھ بادشاہ اسلامی کردار سے عاری تھے تو یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد اسلامی کردار کی حامل رہی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی انہوں نے عظیم خدمت انجام دی ہے۔ بالخصوص اُموی اور عباسی خُلفاء کی اکثریت اسلامی کردار سے متّصف رہی ہے اور اسلام اور مسلمان ان کے دَور میں عظمت و سربلندی سے ہمکنار رہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

دعوی کون جمیع الخلفاء کانوا مشتغلین بما ذکرہ من الخمور والفجور کذب علیهم والحکایات المنقولة فی ذلك فیها ما هو کذب وقد علم ان فیهم العدل والزاهد کعمر بن عبد العزیز والمهتدی بالله واکثرهم لم یکن لهذہ المنکرات من خلفاء بنی اُمیّة وبنی العباس وان کان احدهم قد یبتلی ببعض الذنوب ...... (منهاج السنّة۔ ج ۲ ص ۱۳۷۔ طبع مصر)

"تمام خُلفاء کے متعلق یہ دعوے کہ وہ شراب و کباب اور فسق و فجور میں ملوّث تھے، ان پر سراسر جھوٹ ہے۔ اس بارے میں ان کے متعلق جو حکایات منقول ہیں وہ بھی دروغ پر مبنی ہے۔ یہ واضح ہے کہ ان میں عمر بن عبدالعزیزؒ، مھتدی باللہ جیسے عادل و زاہد خلفاء بھی ہوئے۔ اُموی اور عبّاسی خُلفاء کی اکثریت سے ان بُرائیوں کا ظہور نہیں ہوا۔ اگرچہ ان میں سے چند ایک بعض گناہوں میں ضرور مبتلا ہوئے ...."

خلافتِ راشدہ اور مابعد کی حکومتوں میں فرق کی نوعیت

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب خلافتِ راشدہ کے مابعد قائم ہونے والا بادشاہی نظام بھی اسلامی خلافت کی خصوصیات کا ہی آئینہ دار تھا تو کیا وجہ ہے کہ پہلے خلفائے اربعہ کے دَور کو تو خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے لیکن بعد کے دَور کو خلافتِ راشدہ نہیں بلکہ ملوکیت اور بادشاہت کا دَور کہا جاتا ہے۔ اس تفریق کی بنیاد کیا ہے؟

اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ ایک تو اس کی بنیاد وہ حدیث ہے۔ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد خلافت ۳۰ سال رہے گی الخلافة بعدی ثلاثون سنة۔ اس حدیث کے پیش نظر بعض علماء نے خلافت کے دَور کی تحدید کر دی۔ اس کا مطلب یہ لینا کہ اس کے بعد کا دَور سراسر غیر اسلامی اور جاہلی حکومتوں کا تھا، قطعاً غیر صحیح ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے علمائے اُمّت میں سے کسی نے بھی یہ مفہوم نہیں لیا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خلافت کامل صورت میں ۳۰ سال رہے گی۔ اس کے بعد اس میں ملوکیت اور دُنیا داری کی کچھ آمیزش ہو جائے گی۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ خلافت ہی کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔ جس طرح کہ آج کل کے بعض مفکّرین باور کراتے ہیں۔

راقم کو اس حقیقت کے ماننے میں کوئی تأمّل نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ میں خلفائے راشدین کا اسلامی کردار جتنا واضح اور بے غبار رہا ہے، بعد کے خلفاء و ملوک کا کردار و عمل بالعموم اُس معیار سے فروتر ہی رہا ہے۔ تاہم یہ ماننے میں سخت تأمّل

ہے کہ خلافتِ راشدہ میں شامل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جاہلیت کی آئینہ دار اور اسلامی خصوصیات سے عاری حکومتیں تھیں اور یوں مابعد دورِ حکومت کا سررشتہ خلافتِ اسلامیہ کے تسلسل سے کاٹ دیا جائے۔

جن علماء نے خلافتِ راشدہ اور مابعد میں تفریق کی ہے۔ اس کی بنیاد کردار و عمل کا یہی وہ فرق ہے جو خلفائے راشدین اور مابعد کے خلفاء و ملوک میں پایا جاتا ہے یہ فرق اسلام اور جاہلیت کا نہیں، حق اور باطل کا نہیں بلکہ بہترین اور بہتر کا ہے۔ راجح مرجوح اور افضل و غیر افضل کا ہے۔

علاوہ ازیں اس کی ایک توجیہ علامہ ابن خلدون نے بھی پیش کی ہے جو اگرچہ حضرت معاویہؓ کے ضمن میں ہے۔ تاہم اس سے زیرِ بحث نکتے کی وضاحت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"مناسب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی حکومت اور ان کے حالات ان سے ماقبل خلفاء کی حکومت و واقعات کے ساتھ ذکر کئے جائیں کیونکہ شرف و فضل، عدالت اور صحابیت میں وہ ان ہی کے بعد ہیں اور اس بارے میں حدیث الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنے پیشرو خلفاء کے ساتھ شامل ہیں۔ مؤرخین نے اپنی کتابوں میں جو ان کا ذکر خلفاء سے الگ کیا ہے۔ اس کی دو وجہ ہیں اوّل یہ کہ ان کے عہد میں خلافت میں مغالبہ کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے قبل وہ ایک اختیاری اور اجتماعی چیز تھی۔ چنانچہ مؤرخین نے دونوں حالتوں میں فرق کر دیا۔ پس معاویہؓ ان خلفاء میں سے سمجھے گئے جن میں مغالبے اور عصبیت کا پہلو شامل ہے۔ اسی چیز کو اهل الاهواء

ملوک سے تعبیر کرتے ہیں اور انہیں بھی عام بادشاہوں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ اس بات سے اللہ کی پناہ ہے کہ انہیں مابعد کے بادشاہوں میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دی جائے وہ خُلفائے راشدین میں سے ہیں اور ان کے بعد خلفائے بنی مروان اور خُلفائے عباسی میں سے جو شرف وفضل اور دینداری میں ان کے مثل ہیں، وہ بھی اسی صف میں شامل ہیں۔ بادشاہت رُتبے میں خلافت سے کم تر نہیں۔

دُوسری وجہ اس بات کی کہ اُنہیں خُلفائے اربعہ کی بجائے خلفائے بنی اُمیہ کے ساتھ ذکر کیا گیا، یہ ہے کہ اُموی خُلفاء سلسلۂ نسب کی ایک ہی کڑی سے منسلک تھے اور ان میں سب سے نمایاں حضرت معاویہؓ تھے۔ بنا بریں اُنہیں ان کے ہم نسبوں کے ساتھ ملا دیا گیا اور پہلے خلفاء اربعہ چونکہ مختلف الانساب تھے، اس لیے انہیں ایک سلسلے میں ذکر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ اُموی تھے لیکن شرف وفضل میں قربت کی وجہ سے انہیں ان ہی کے ساتھ شامل کر دیا گیا،، (تاریخ ابن خلدون ۔ خاتمۂ جلد دوم)

۴

مطلوب اور نامطلوب کی بحث

اس مقام پر ایک اور سوال یہ اُٹھایا جاتا ہے کہ کیا اسلام میں خلافت اور مُلوکیّت دونوں یکساں ہیں یا ان میں سے ایک نظام مطلوب ہے اور دوسرا بامرِ مجبوری قابلِ برداشت ہے؟ راقم کی گزشتہ وضاحتوں کو سامنے رکھا جائے تو اس سوال کا جواب بہ آسانی ممکن ہے۔ یہ سوال بنیادی طور پر مغربی تصوّرِ جمہوریّت سے تاثر پذیری کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو جمہوریّت کی نیلم پری کا اسیر بنانے کے لیے مُلوکیّت کو مطلقاً ایک خوفناک اور گھناؤنی شکل میں پیش کیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں مُلوکیّت بجائے خود بُری نہیں، اس کا استعمال اسے مطلوب بھی بنا سکتا ہے اور نامطلوب بھی۔ جس طرح ذاتی ملکیّت بجائے خود اسلام میں ناپسندیدہ اور ممنوع نہیں۔ چاہے اس طرح آدمی لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو جائے۔ یہی ملکیّت نامطلوب اُس وقت ہو گی جب مال و دولت کی فراوانی انسان کو جادۂ مستقیم سے ہٹا کر اسراف و تبذیر، زکوٰۃ و صدقات سے اعراض اور غریبوں کی خوں آشامی جیسی صفاتِ مذمومہ اس کے اندر پیدا کر دے۔ مال و دولت کی فراوانی عام طور پر انسان کے لئے مہلک ہی ہوا کرتی ہے اور بہ مشکل ہی آدمی رضا کارانہ طور پر اس کے وہ حقوق ادا کرتا ہے جو اللہ تعالٰے نے اس کے مال میں رکھے ہوتے ہیں۔ اِسی بنا پر اشتراکیّت نے "ذاتی ملکیّت" کو ہی بجائے خود فساد کا منبع قرار دے کر اسے افرادِ معاشرہ کے لیئے ناجائز قرار دے دیا ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام اس نقطۂ نظر کو صحیح تسلیم نہیں کرتا، وہ داخلی اصلاح کے ذریعے مال و دولت کے طبعی نقصانات سے انسان کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے اس نے

مال و دولت کے سمیٹنے کی بے پایاں خواہش کی سخت مذمت اور آخرت میں اس کے لیے عذابِ شدید کی وعید بھی فرمائی ہے لیکن ذاتی ملکیت پر اس نے قدغن نہیں لگائی صحابۂ کرامؓ میں سینکڑوں ایسے جلیل القدر حضرات تھے جنہیں آج کل کی اصطلاح میں لکھ پتی اور کروڑ پتی کہا جا سکتا ہے لیکن اس چیز نے انہیں اسراف و تبذیر پر یا زکوٰۃ و صدقات سے اعراض پر نہیں ابھارا۔ دراں حالیکہ "سرمایہ داری" کی اسلام نے عام طور پر مذمت ہی کی ہے۔

اسی طرح ملوکیت کو بجائے خود فاسد قرار دینا مغرب کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے، اسلام میں اس کی یہ حیثیت نہیں۔ اسلام نے اس کی اگر کہیں مذمت کی ہے تو وہ اس کے غلط استعمال کی وجہ سے کی ہے جو عام طور پر خدا ناآشنا بادشاہ کیا کرتے ہیں۔ کوئی بادشاہ اگر اس کا صحیح استعمال کرے، ملوکیت کو وہ خدا کے احکامات کو نافذ کرنے، منکرات کو روکنے اور خدا کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرا کے صرف خدائے واحد کا بندہ بنانے کے لئے استعمال کرے تو یہ ملوکیت مذموم نہیں، بالکل اسی طرح مطلوب ہے۔ جس طرح اسلام میں ابوبکر صدیقؓ اور عثمانؓ کی "سرمایہ داری" مذموم نہیں مطلوب ہے۔ علامہ ابن خلدون اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وہ بادشاہت جو غلبۂ حق، مصالح عامہ اور لوگوں کو دینِ حق پر چلانے کی خاطر ہو، شارع کی نظر میں مذموم نہیں۔ شارع نے اس کی جو کہیں مذمت کی ہے۔ وہ اس پہلو سے ہے جب اسے باطل کے غلبے کے لئے اور لوگوں کو اپنی اغراض و شہوات کے مطابق کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ کوئی بادشاہ اگر مخلص ہو اور بادشاہت سے اس کا مقصد محض رضائے الٰہی کی خاطر لوگوں کی بھلائی، ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلانا اور اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرنا ہو تو یہ مذموم

نہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے ایسی بادشاہت کے حصول کے لیے دعا مانگی ہے (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے) رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي ”یا اللہ مجھے ایسی بادشاہت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو نہ ملے“ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میری نبوت و بادشاہت کا مصرف باطل نہیں ہو سکتا“ (مقدمہ ابن خلدون فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک)

ایک دوسرے مقام پر علامہ لکھتے ہیں:۔

”واضح رہے کہ شریعت نے بذاتہ ملوکیت کی نہ مذمت کی ہے۔ نہ اس کے قیام سے منع کیا ہے، البتہ اس کے اُن مفاسد کی مذمت کی ہے جو اس سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جیسے قہر، ظلم اور تمتع باللذات۔ یہ اس کے توابع ہیں جو بلاشک ممنوع ہیں۔ اسی طرح اس نے عدل و انصاف، دین کے شعائر و مراسم کا قیام اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی تعریف کی ہے نیز اس کے بدلے میں ثواب کی بشارت بھی دی ہے، یہ چیزیں بھی بادشاہت کے توابع ہیں۔ پس شریعت جب بادشاہت کی مذمت کرتی ہے تو اس سے مراد اس کی پہلی حالت ہے، نہ کہ یہ دوسری۔ بادشاہت کی فی نفسہٖ شریعت نے نہ مذمت کی ہے نہ اس کے ترک کر دینے کا مطالبہ کیا ہے، اس نے بعض چیزوں کی جو مذمت کی ہے اُس کا مقصد اس سے اُس چیز کا بالکلیہ ترک نہیں، اس سے اس کا اصل مقصد اُس کا رُخ حق کی طرف موڑنا ہے“ (مقدمہ ابن خلدون فصل اختلاف الامۃ فی حکم منصب الخلافۃ و شروطہ)

لہٰذا ملوکیت کے متعلق یہ دعویٰ کہ وہ صرف قابلِ برداشت ہے، مطلق

نہیں، صحیح نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بعض صورتوں میں وہ خلافت بھی نامطلوب و ناپسندیدہ ہو سکتی ہے جو طریقۂ ولی عہدی کی بجائے عوام کی آزادانہ رائے سے قائم ہو لیکن خلیفہ کا کردار اس سے مختلف ہو جس کا اسلام اس سے تقاضا کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک طریقۂ ولی عہدی سے قائم ہونے والی بادشاہت کا حکمران ٹھیک اُن اُصولوں کے مطابق حکمرانی کرتا ہے، جن کی اسلام نے ہدایت کی ہے۔ جیسے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ اور ان جیسے دیگر خلفاء و ملوک ہیں۔ ایسے نیک، عادل اور خدا ترس حکمرانوں کی "ملوکیت" محض قابلِ برداشت نہیں، عین مطلوب ہے، یہاں مطلوب اور نامطلوب اور یکساں وغیر یکساں کی بحث ایسی ہی مغالطہ انگیز ہے جیسے آجکل اشتراکیت زدہ حضرات موجودہ سرمایہ داروں کا کردار پیش کر کے سوال کریں کہ اسلام میں حضرت ابوذرؓ کا فقر مطلوب ہے یا قارون کی سرمایہ داری یا یہ دونوں ہی اسلام میں یکساں ہیں؟ ظاہر ہے سوال کی یہ تکنیک فریب اور مغالطے پر مبنی ہے۔ ایک عام شخص اس کا یہی جواب دے گا کہ اسلام میں فقرِ ابوذرؓ ہی مطلوب و پسندیدہ ہے دراں حالیکہ سرمایہ داروں میں سب قارون ہی نہیں ہیں، ان میں عثمانؓ اور ابوبکرؓ بھی ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ و زبیر، یعلیٰ بن اُمیہ اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ہیں (تفصیل کے لیے دیکھئے مقدمہ ابن خلدون، فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک)

حضرت علیؓ کے فقر کی داستانیں بہت مشہور ہیں لیکن معتبر روایات اس کے برعکس ہیں۔ وہ بھی اپنے مزاج و طبیعت کی سادگی اور زہد کے باوصف "سرمایہ دار" تھے۔ پانچ مختلف مقامات پر ان کی زرعی زمینیں تھیں جن میں سے چار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا فرمائی تھیں اور بعد میں ایک حضرت عمرؓ نے عطا کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت ان زمینوں کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ دینار

تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی ذرائع آمدنی تھے، تمام آمدنی کی سالانہ زکوٰۃ خود حضرت علیؓ کے بقول چالیس ہزار دینار نکلتی تھی (ملاحظہ ہو السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۶ ص ۴۴، کتاب الخراج یحییٰ بن آدم ۷ ص ۸۷، ۸۳۔ فتوح البلدان ص ۲۰۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۷۔ ص ۵۳۲۔)

اِسی طرح اور بہت سے صحابہ اصحاب ثروت تھے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی کڑی حکیم محمد سعید صاحب جیسے حضرات ہیں جنہوں نے اپنی ساری دولت اور سرمائے کو ملی کاموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ کَثَّرَ اللّٰہُ اَمْثَالَھُمْ فِیْنَا۔ ان کی سرمایہ داری کو کون مذموم کہہ سکتا ہے؟ اسلام کی نظر میں ان حضرات کی سرمایہ داری بھی عین مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ اسی طرح حضرت معاویہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے بادشاہوں کی ملوکیت بھی اسلام میں ناپسندیدہ نہیں۔ صرف وہ بادشاہت ناپسندیدہ ہے۔ جو انسان کو خود سر اور خدا کی ہدایات واحکامات سے بے پروا بنا دے۔ جس طرح سرمایہ داری نہ مطلقاً مذموم ہے نہ محمود۔ اس کا استعمال اسے مذموم بھی بنا سکتا ہے اور قابل تعریف بھی اسی طرح ملوکیت نہ مطلقاً مذموم ہے نہ محمود، اس کا استعمال اسلام کی نگاہ میں اسے مطلوب و محمود بھی بنا سکتا ہے اور مذموم و نامطلوب بھی۔

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ اسلامی خلفاء و ملوک کی بادشاہت کو مطلقاً مذموم قرار دے کر تمام مسلمان بادشاہوں کو بلا استثناء گردن زدنی باور کرانا صحیح نہیں ہے۔ ان میں اچھے بُرے دونوں طرح کے بادشاہ گزرے ہیں، اچھوں کو اچھا کہا جائے اور بُروں کو بُرا۔ محض بادشاہی نظام کی وجہ سے حضرت معاویہؓ سمیت تمام اسلامی بادشاہوں کو بُرا کہنا عقل وانصاف سے بعید تر بات ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ سلطانیٔ جمہور کے اس دور

بادشاہت کی یہ تائید و حمایت عجیب بات ہے تو عرض ہے کہ پاکستان میں کوئی بادشاہی نظام قائم ہونے نہیں لگا ہے کہ اس کے جواز اور تائید کے لیے دلائل فراہم کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے بلکہ یہ تحریر احتجاج ہے اُس ظلم کے خلاف جو آج کل کے بہت سے منکرین اسلام نے خلافت یا جمہوریت اور ملوکیت کی بحث کے ضمن میں بلا استثناء تمام مسلمان بادشاہوں کے ساتھ کیا ہے۔ اور یوں ۳۰ سالہ دورِ خلافت اور ڈھائی سال خلافتِ عمر بن عبدالعزیز کے نکال کر پوری تاریخ اسلام کو ظلم و ناانصافی، جبر و تشدد اور تحکم و دھاندلی کی تاریخ باور کرایا ہے۔ اور اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید کے لئے قصرِ صحابیت تک میں نقب لگانے میں انہیں تامل نہیں ہوا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ سے لے کر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت معاویہؓ وغیرہم جلیل القدر صحابہ بھی ان کی ناوک افگنی سے محفوظ نہیں رہے۔ ان منکرین نے مذکورہ نفوس قدسیہ کی سیرت و کردار کو اس طرح مسخ کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں قرآن کریم کی وہ مدح و منقبت، جو اس میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کی گئی ہے ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ فضائل نری داستان سرائی۔ تاریخ اسلام کے یہ مظلوم ان منکرین کو خطاب کر کے بجا طور پر کہہ سکتے ہیں ؎

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا

—— ۵ ——

ہمارا نقطۂ نظر اور اس کے ثمراتِ حسنہ

بہرحال خلاصہ سابقہ گفتگو کا یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ خلافت صرف ۳۰ سال چل کر ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ اسلامی نظام اور اس کی عملداری اس کے بعد بھی صدیوں تک قائم رہی ہے۔ اسلامی خلفاء و ملوک اپنی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوصف بحیثیت مجموعی اسلامی احکام و شعائر کے پابند رہے اور ان کے ادوارِ حکومت میں اسلامی قوانین کا پرچم سربلند رہا۔ کسی بھی اسلامی بادشاہ نے ـــــ سوائے ایک مغل فرماں روا ـــــ اکبر ـــــ کے " دینِ اسلام سے بغاوت نہیں کی ۔ اس لئے یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے بعد " ملوکیت " کے آتے ہی اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات اس طرح ختم ہو گئیں جس طرح سورج کے طلوع ہوتے ہی رات کی تاریکی معدوم ہو جاتی ہے بلکہ یہ خصوصیات دَورِ ملوکیت بالخصوص حضرت معاویہؓ کے دَور میں بھی بدستور موجود رہی ہیں جنہیں آج کل کے مفکرین ملوکیت کا بانی اور اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات کو مٹانے والا باور کرا رہے ہیں ۔ اور تاریخِ اسلام میں بیسیوں ایسے " بادشاہ " ہوئے ہیں ۔ جن کی " ملوکیت " انہی خصوصیات کی آئینہ دار تھی جو خلافت کی بتلائی جاتی ہیں ۔

حضرت معاویہؓ وغیرہ کے متعلق کتبِ تواریخ کی بعض ظاہری روایات سے جو یہ تأثر آج کل دیا جا رہا ہے کہ ان کے دَور میں (نعوذ باللہ) اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات کو مٹا کر رکھ دیا گیا تھا ، یہ تأثر قطعاً خلافِ واقعہ اور بے بنیاد ہے ۔ یہ حقائق و واقعات کے برعکس تخیل و تصورات کا ایسا آشیانہ ہے جو

شاخِ نازک پر قائم کیا گیا ہے جو بادِ تحقیق کے ایک ہی جھونکے سے زمیں بوس ہو جاتا ہے اس قسم کے کمزور سہاروں پر تو پھر اسی قسم کا دعویٰ خلافت راشدہ کے نصف آخر دورِ عثمانؓ و علیؓ ــــــ کے متعلق بھی کیا جا سکتا ہے۔ "تحقیق" کی یہ روِ چل نکلی تو شاہدِ تحقیق کی عشوہ طرازیوں سے حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کو بچانا بھی مشکل ہو جائے گا۔

راقم کے پیش کردہ نقطۂ نظر کے جو نتائج نکل سکتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت معاویہؓ وغیرہ جلیل القدر صحابہ کرام کے اقدامات کی ایسی معقول توجیہ ممکن ہے جس سے ان کا شرفِ صحابیت مجروح نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کو ان سے جو عقیدت اور حسنِ ظن ہے، وہ باقی رہتا ہے اور سب سے بڑھ کر قرآن و حدیث نے ان کی جو صفات بتلائی ہیں، ان کی نفی نہیں ہوتی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

۲۔ موجودہ نسل کے ذہن میں اپنے اسلاف سے نفرت کی بجائے، محبت وعقیدت پیدا ہوگی اور ان کی نگاہیں اپنے حال و مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے غیروں کی طرف نہیں بلکہ اپنے اُن اسلاف ہی کی طرف اُٹھیں گی جو اپنی بعض کوتاہیوں کے باوصف مسلمان اور اسلامی عظمتوں کے علمبردار تھے جو ہمیشہ اسلام کی طرف ہر اُٹھنے والے ہاتھ کو قلم اور اس کی طرف اُٹھنے والے قدموں کو شل کر دیتے رہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

۳۔ اور سب سے بڑھ کر اسلام کا نظامِ حکومت "عنقا صفت" نہیں رہتا کہ جس کی جھلک دنیا نے ۳۰ سال بلکہ ۱۲، ۱۳ سال ہی (عمر فاروقؓ کی شہادت تک) دیکھی ہو اس کے بعد وہ ایک فرقے کے امام غائب کی طرح ایسا روپوش ہو گیا کہ جس کو دوبارہ منظر عام پر دیکھنے کے لیے چودہ صدیاں بیت گئیں اور دیکھتے دیکھتے تمام مسلمانوں کی آنکھیں بھی پتھرا گئی ہوں بلکہ اسلام کا نظامِ حکومت ایک متحرک، جاندار اور ہر دور میں قابلِ عمل نظر آتا ہے کیونکہ فترات کے ساتھ ساتھ وہ ہر دور میں اپنی صحیح رُوح کے ساتھ رُو بہ عمل رہا۔ حتیٰ کہ اس دور میں بھی وہ سعودی عرب میں رُو بہ عمل، اپنی قوت اور تازگی

کی شہادت دے رہا ہے۔ مختلف وقتوں میں بعض بادشاہوں کے غلط طرزِ عمل کے نتیجے میں اسلامی حکومت کی خصوصیات کے بہت سے نقوش دھندلاتے ضرور رہے ہیں تاہم ان کی کچھ نہ کچھ چھاپ پھر بھی ہر دور میں نمایاں رہی ہے۔ زوال و تغیر ایک فطری عمل ہے جس سے دنیا کی ایسی کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہو سکتی جس کا وجود محض چند روزہ نہیں، صدیوں تک رہتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون یا نظام ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس پر مرورِ ایام اور گردشِ لیل و نہار نے زوال و تغیر کا کچھ نہ کچھ سایہ نہ ڈالا ہو۔ اسلامی نظامِ حکومت نے تیرہ صدیاں دنیا پر حکمرانی کی ہے۔ یہ کوئی تھوڑا عرصہ نہیں۔ بڑا طویل راستہ ہے جو قطع کر کے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ قطعاً ناممکن تھا کہ اتنی طویل صدیوں میں اس پر تغیر کا کوئی وار نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو وہ اسے سہہ جاتا اور اس کا کوئی اثر قبول نہ کرتا۔ اس پر بڑے بڑے تغیرات آئے، متعدد مرتبہ اس کی زندگی تک خطرے میں پڑ گئی لیکن پھر کوئی مردِ درویش آتا۔ مردے از غیب ظہور پذیر ہوتا اور اس کی عروقِ مردہ میں تازہ خون دوڑا کر اس کو حیاتِ نو بخش دیتا۔ پس اس کی کوتاہیوں اور خامیوں کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کر دینا یا ایسا طرزِ فکر اختیار کرنا جس سے یہ تأثر قائم ہو کہ اسلامی نظامِ حکومت صرف ۳۰ سال ہی چلا۔ اس کے بعد سے آج تک روئے زمین پر کہیں (سوائے عمر بن عبدالعزیز کے مختصر ترین دور کے) یہ اپنی اصلی صورت میں قائم نہ ہو سکا، یاس انگیز طرزِ عمل ہے جس سے مسلمانوں کی موجودہ نسل کے دل و دماغ سے اسلامی حکومت کے قیام کے جذبے کا ہی سرے سے مفقود ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس کے برعکس راقم کے پیش کردہ نقطۂ نظر سے وہ اب بھی اسی طرح قابلِ عمل ہے جس طرح پچھلے ادوار میں وہ وقتاً فوقتاً روئے زمین پر اپنی روح کے ساتھ جلوہ گر رہا ہے۔ اس سے قوم کے اندر مایوسی کی لہر نہیں بلکہ ان کے اندر امیدوں کے چراغ روشن ہوں گے، ان کے جذباتِ عمل ٹھٹھریں گے نہیں بلکہ اور ابھریں گے۔

اسلامی حکومت کا قیام انہیں ناممکن نہیں بلکہ عین ممکن نظر آئے گا

دورِ حاضر کے مفکّرین کا نقطۂ نظر اور اس کے خطرناک نتائج

اس کے برعکس اُن حضرات اہل علم کا، جن کی فکری غلطیوں کی نشاندہی اس مقالے میں کی گئی ہے، نقطۂ نظر حسب ذیل ہے۔

۱۔ اسلام کا نظامِ حکومت (خلافت) تھوڑے ہی عرصے بعد "ملوکیت" میں تبدیل ہوگیا اور اس کا آغاز بھی حضرت عثمانؓ کے اقدامات سے ہوا کہ اُنہوں نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو فائز کیا، مزید برآں ان کے ساتھ خصوصی مراعات برتیں، مسلمانوں کے مشترکہ بیت المال سے اپنے رشتہ داروں کو خاص طور پر عطیے دیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضرت علیؓ نے اپنے دَورِ خلافت میں "ملوکیت" کے اس رجحان کو، جس کی بنیاد حضرت عثمانؓ رکھ گئے تھے۔ روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور حضرت معاویہؓ کے خلیفہ بنتے ہی نظامِ خلافت ختم ہوگیا۔

۲۔ حضرت معاویہؓ اپنے دَورِ حکومت میں (۶۰ھ تک) اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات کو مٹا کر رکھ دیا اور اس کی جگہ ایک آمرانہ ومستبدانہ نظامِ حکومت قائم کیا، جو ہر اسلامی خصوصیت سے عاری اور ہر جاہلی اور دنیوی حکومت کی خصوصیات کا آئینہ دار تھا۔ اُس وقت سے لے کر مصطفےٰ کمال پاشا کے الغائے خلافت تک باستثنائے عمر بن عبدالعزیزؒ اسلام میں یہی نظامِ ملوکیت قائم چلا آیا۔

۳۔ مزید برآں اس ضمن ان حضراتِ اہلِ علم نے حضرت عثمانؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت معاویہ، حضرت عائشہ اور حضرات طلحہ و زبیر وغیرھم، رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کردار کو جس بُری طرح مسخ کر کے پیش کیا ہے وہ

ایک الگ دلخراش داستان ہے جیسا کہ پہلے بھی میں نے اشارہ کیا ہے۔

اِس نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کے جو نتائج نکل سکتے ہیں اور نکل رہے ہیں وہ درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ صحابۂ کرام کی ردائے تقدّس و عظمت تار تار ہو گئی ہے، عقیدت و حُسنِ ظن کی جگہ نفرت و سُوءِ ظن نے لے لی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دُشمنانِ صحابہ کو ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو گئی ہے۔ اَب یہ ڈیوٹی صرف مخصوص فرقے کی ہی نہیں رہی کہ وہ صحابۂ کرامؓ کو بُرا کہیں، اہلِ سُنّت میں سے بھی اب ہر کہ و مہ حضرت معاویہؓ وغیرہ پر اس طرح تنقید کرنے لگا ہے، جیسے وہ ایک ایسے عام انسان تھے، جن میں خوبی کوئی نہ تھی، البتہ بُرائیوں کا وہ مجموعہ تھے۔ صحابۂ کرامؓ کے اُس کردار میں، جسے قرآن و حدیث نے بیان کیا ہے۔ اور اس کردار میں، جسے مذکورہ اہلِ علم نے اپنی ذہانت اور قوّتِ تخلیق سے پیکرِ وجُود عطا کیا ہے، تطبیق ناممکن ہو گئی ہے۔ ایک کو صحیح ماننے کی صُورت میں لازمًا دُوسرے کی تکذیب کرنی پڑتی ہے۔ بیک وقت دونوں کی صحت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

جب اسلام کے نظامِ حکومت کو خود حضرت عثمانؓ و حضرت معاویہؓ وغیرھم نے ختم کر دیا اور دُوسرے تمام صحابہؓ نے بھی اس چیز کو خاموشی سے برداشت کر لیا، پیغمبرِ اسلامؐ کے تربیت یافتہ اصحاب اس کو پُورے ۳۰ سال بھی اپنی اصلی صورت میں قائم نہ رکھ سکے، حضرت علیؓ نے اگر کچھ کوشش کی بھی تو صحابۂ کرامؓ نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ بلکہ حضرت حسنؓ نے تو بالکل گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور اس کے بعد سے آج تک اسلام کے نام پر "مُلوکیّت" نافذ ہے جس میں اسلامی حکومت کی کوئی خوبی موجُود نہیں ہے۔ اس سے لازمًا یہ احساسِ مایوسی ذہنوں میں اُبھرتا ہے کہ اب اسلامی حکومت کا قیام قطعًا ناممکن ہے۔ جب صحابۂ کرام ایک قائم شدہ نظامِ خلافت کو برقرار نہ رکھ سکے تو

اب وہ کون مسیحا نفس ہے جو اس نظام کا از سرِ نو احیاء عمل میں لا سکے ؟

۳ ۔ اس سے اُن متجددین و مستشرقین کے اس سازشی ذہن کی تائید ہوتی ہے جو یہی کہتے ہیں کہ اسلام کا نظام حکومت ایک خاص دَور اور ایک خاص ماحول کے لئے تھا جو اپنی زندگی کے ۳۰ سال پورے کر کے ختم ہو چکا ہے ، اب اس کے احیاء کی آرزو کو سینوں سے چمٹائے رکھنا دانش مندی نہیں ۔ آج کل اس دَور کے جدید تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو اپنا نظامِ حکومت مرتب کرنا چاہیئے ۔

بگاڑ کے اسباب

ایک اور بنیادی غلطی بعض مفکرّین کی یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ حکومت میں بگاڑ کا واحد سبب اُنہوں نے "ملوکیت" کو قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ملوکیّت قائم نہ ہوتی تو نظامِ خلافت اپنی صحیح صورت میں قائم اور اسلام کا نظامِ سیاست بگاڑ سے محفوظ رہتا۔ لیکن یہ دعویٰ بھی بنیادی طور پر غلط ہے۔

کیونکہ ایک تو اس سے ملوکیّت کا فی نفسہٖ مذموم ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ ملوکیّت بجائے خود مذموم چیز نہیں۔ بعض انبیاء بھی ملوک رہے ہیں۔ اور قرآن نے ان کی ملوکیّت کا تذکرہ اچھے انداز میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی تاریخ میں بھی عمر بن عبدالعزیزؒ اور ان جیسے بہت سے عُمدہ کردار کے بادشاہ ہوئے ہیں۔ جن کی ملوکیت کو مذکورہ حضراتِ اہلِ علم بھی مُستحسن تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ملوکیّت بجائے خود مذموم چیز ہوتی تو اس نظامِ مملکت کے تحت کسی بھی بادشاہ کو صحیح سیرت اور اسلامی کردار کا حامل نہیں ہونا چاہیئے تھا، جیسا کہ یہ حضرات محض ملوکیّت کی وجہ سے ہی حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو بھی اسلامی سیرت و کردار سے عاری باور کرانے پر مصر ہیں۔

ثانیاً اگر "ملوکیّت" ہی بگاڑ کا واحد سبب ہے تو پھر اس کی کیا معقول توجیہ کی جائے گی کہ بگاڑ کا آغاز خود یہ حضرات حضرت عثمانؓ کے سیاسی اقدامات سے کرتے ہیں اور انہیں فسادِ احوال کا سبب گردانتے ہیں حالانکہ یہ خلافتِ راشدہ کا دَور ہے، "مُلوکیت ابھی نہیں آئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ خود ان کی تصریحات کے مطابق خلافتِ راشدہ میں یہ بگاڑ کیوں آیا؟ حضرت علی رضؓ کا پورا دَورِ خلافت

خانہ جنگی اور دیگر انتشار و خلفشار میں گزرا۔ یہ بھی سیاسی بگاڑ ہی ہے یہ بگاڑ خلافتِ راشدہ میں کہاں سے آیا؟ اگر بگاڑ کا واحد یا اہم سبب صرف ملوکیت ہے تو پھر خلافتِ راشدہ کو کم از کم سیاسی بگاڑ سے محفوظ رہنا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے بگاڑ خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی آیا ہے جس کی وجہ سے خلافتِ راشدہ کا نصف آخر اپنے نصف اول سے قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ تجزیہ کہ ملوکیت ہی بگاڑ کا سبب ہے، صحیح نہیں۔

دراصل غلطی کی بنیادی وجہ ان کا یہ خیال ہے کہ بگاڑ صرف سیاست (نظامِ حکومت) میں آیا ہے۔ باقی اخلاقیات، معاملات اور عبادات کے تمام شعبے بدستور اسی ڈگر پر تھے جس پر ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور میں تھے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بگاڑ اوّلاً معاشرتی حالات و اخلاقیات اور افرادِ ملک کے رجحان و طبع میں آتا ہے سیاسیات اخلاقیات ہی کا ایک شعبہ ہے۔ اس لیے ملک و معاشرے کا جو عمومی مزاج ہوگا، یہ ناممکن ہے کہ حکومت کا مزاج اس سے مختلف ہو۔ سیاسیات (نظامِ حکومت) کا ضمیر ہمیشہ اہلِ ملک کے مزاج و کردار سے اٹھتا ہے۔ اگر افرادِ ملک کا عمومی مزاج و کردار فاسقانہ ہوگا تو اس سے جو نظامِ حکومت جنم لے گا، وہ غیر صالح ہوگا، صالح کبھی نہیں ہوسکتا۔ کافرانہ مزاج کے معاشرے سے متشکل ہونے والا نظامِ حکومت ہمیشہ کافرانہ مزاج کا حامل ہوگا۔ تاریخ میں اس کی مثالیں تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے باہر سے حملہ کر کے کسی غیر اسلامی ملک کو فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کر لی۔ لیکن ایسی کوئی مثال تاریخ پیش نہیں کرسکتی کہ کسی غیر اسلامی ملک و معاشرے سے از خود کسی صالح اور اسلامی نظامِ حکومت نے جنم لے لیا ہو۔ گویا نظامِ حکومت کے مزاج کو بنانے میں ملک و معاشرہ کا مزاج اصل کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے جتنے ممالک بھی فتح کیے اور وہاں اسلامی نظامِ حکومت نافذ

کیا گیا، اس مفتوح ملک کے افراد باوجود قبولِ اسلام کے چونکہ اُس معاشرے کے افراد کی طرح نہیں تھے جس معاشرے کی بُنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے تربیت یافتہ اصحابِ رسولؐ پر تھی۔ اس لیے وہاں کا نظامِ حکومت بھی باوجود اسلامی ہونے کے کبھی اُس اسلامی نظامِ حکومت کے مماثل نہ ہوسکا جسے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے مکّی و مدنی معاشرے میں نافذ کیا تھا۔ تمام ممالکِ مفتوحہ میں قائم کردہ اسلامی نظامِ حکومت کے اندر اپنے اپنے ماحول، معاشرے کے مزاج اور وہاں کے مخصوص رُجحانات کے کچھ نہ کچھ غیر اسلامی اثرات ضرور پائے جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ سے ایک شخص نے پوچھا "یہ کیا بات ہے کہ آپ کے عہدِ خلافت میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں ایسا نہیں ہوا؟" حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا:۔

"ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد کی رعایا مجھ جیسے افراد پر مشتمل تھی اور میری رعایا تم جیسے لوگوں پر مشتمل ہے" (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷، فصل ولایتِ عہد)

حضرت علیؓ کے اس فرمان سے اس نکتے کی وضاحت خوب ہو جاتی ہے جس کی طرف خاکسار اشارہ کر رہا ہے۔

اس حقیقت سے مجالِ انکار نہیں اور تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے کہ نبیٔ اُمّی حضرت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اسلامی معاشرہ بحیثیت مجموعی مائل بہ انحطاط و تغیّر ہی ہے اور ان کے ماننے والوں کی ایمانی و قلبی حیثیت بھی اسی حساب سے بتدریج زوال پذیر ہے۔ اس انحطاط و زوال کے اثرات دَورِ صحابہؓ سے ہی نمایاں ہونے شروع ہوگئے۔ اس کا مطالعہ آپ اس طرح کریں دیکھیں کہ جو دَورِ زمانۂ نبوّت سے جتنا متّصل ہے، اُسی حساب سے اس میں

بہ اعتبارِ ادوار مابعد خیر و برکت بھی زیادہ اور فزوں تر ہے اور جو دور، زمانۂ نبوت سے جس قدر دور ہے اسی قدر اس میں خیر و برکت میں کمی پیدا ہوتی چلی گئی ہے اسی چیز کو خود نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے اس طرح ادا فرمایا خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم (الحدیث) کہ سب سے بہتر میرا دور ہے۔ دوسرے نمبر وہ جو اس کے بعد اور میرے دور سے متّصل ہے۔ تیسرے نمبر وہ جو اس کے بعد ہے"۔ ایک دوسری روایت میں آپؐ نے فرمایا لا یأتی علیکم زمان الا الذی بعدہ شر منه (صحیح بخاری، کتاب الفتن) "ایک زمانہ گزر جانے کے بعد جب تم پر دوسرا زمانہ آئے گا، وہ پہلے کی بہ نسبت بدتر ہوگا"۔ اور متعدد حدیثوں میں آپؐ نے اس نکتے کی وضاحت فرمائی ہے کہ بُعدِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدعملی، بُخل، قتال و جدال، شہادتِ زُور اور دیگر صفاتِ مذمومہ میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ حافظ ابن حجرؒ اس قسم کی احادیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وہ خرابیاں، جن کی خبر ان احادیث میں دی گئی ہے۔ عہدِ صحابہؓ سے ہی ان کی ابتداء ہو گئی تھی۔ پھر بعض جگہوں پر ان میں مزید اضافہ ہو گیا اور جوں جوں قیامت قریب آئے گی، ان خرابیوں میں استحکام ہی ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ خرابیاں تمام شہروں میں روز افزوں ہیں، کہیں کم کہیں زیادہ۔ جب ایک طبقہ ختم ہو جاتا ہے، اس کی جگہ لینے والے دوسرے طبقے میں بہ نسبت پہلے کے بہت زیادہ نقص واقع ہو جاتا ہے"۔ (فتح الباری، باب ظہور الفتن)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم لکھتے ہیں۔

"نبوّت و رحمت کی برکات کی محرومی و فقدان کا ایک تدریجی تنزّل تھا اور بدعات و فِتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی، کالحصیر عوداً عوداً۔ جو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے شروع ہوئی اور جس قدر عہدِ نبوّت سے دوری

بڑھتی گئی۔ اتنی ہی عہدِ نبوّت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے اُمّت محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت وخلافتِ کبریٰ کے معاملے ہی میں نہیں ہوئی بلکہ قوام ونظامِ اُمّت کے مبادیات واساسات سے لے کر حیات شخصی وانفرادی کی اعتقادی وعملی جزئیات تک ساری باتوں کا بھی حال ہوا،، (مسئلہ خلافت صلى ۱۴۱)

مطلب ان احادیث، اقوال اور عبارتوں کا یہ ہے کہ بگاڑ کا عمل تدریجی تھا اور اس کا رُخ بھی صرف سیاسیات (نظامِ حکومت) ہی کی طرف نہ تھا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں یہ اپنی رفتار سے آنا شروع ہو گیا تھا۔ اخلاقیات، عبادات، معاملات، معیشت ومعاشرت اور تہذیب تمدّن سب پر ہی اس نے اپنا اثر کیا۔ حکمران واہل کارانِ حکومت بھی معاشرے ہی کے فرد ہوتے ہیں۔ نظامِ حکومت چلانے کے لئے وہ آسمانوں سے نازل نہیں ہوا کرتے ہیں۔ معاشرے کے اچھے یا بُرے اثرات سے وہ خود کو پُوری طرح محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ غیر شعوری طور پر معاشرے کے اثرات ان کے اندر بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اَدوارِ مابعد رسالت پر نظر ڈالیے کہ حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کا دَورِ خلافت زمانۂ رسالت سے بالکل متّصل ہے۔ اس بناء پر وہی دَورِ فیوض وبرکاتِ الٰہیہ کا سب سے زیادہ مظہر اور عام معاشرہ صحبتِ نبویؐ کے ہمہ گیر اثرات میں پختہ تر ہے۔ جس کی وجہ سے خلافتِ صدیقی میں ذیل کی خصوصیات نمایاں ہیں۔

- تمام مسلمانوں میں اتّحاد واتّفاق اور کامل یگانگت ہے۔ حاکم ومحکوم۔ راعی ورعایا اور امیر وغریب سب اشاعتِ اسلام اور استیصالِ کُفر کے جذبے سے سرشار ہیں۔
- دینی مسائل واحکام میں مسلمانوں میں باہم کوئی قابلِ ذکر نزاع پیدا نہیں ہُوا

حتیٰ کہ سیاسیات میں بھی شدّتِ اختلاف کی کوئی نمایاں مثال نہیں ملتی۔

● دنیا سے بے رغبتی اور فکرِ آخرت کا کم و بیش وہی حال ہے جو خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دَورِ مُبارک میں تھا۔

● صُحبتِ نبویؐ کے قرب اور زمانۂ رسالت سے اتصال ہی کا ایک پرتو یہ تھا کہ خود خلیفۃ الرسولؐ ابوبکر صدیقؓ اپنے سیاسی و دینی اجتہادات میں خطا سے سب سے زیادہ محفوظ رہے، گو اوّلاً حضرت ابوبکر صدیق کے اجتہادات اور سیاسی آراء میں بعض حضرات نے اختلاف اور توقّف کیا لیکن بالآخر انہوں نے بھی بعد میں ان کے موقف کی تائید و تصویب کی۔

● ملک و معاشرہ داخلی انتشار، شرپسند عناصر اور سازشی گروہ کی آماجگاہ بننے سے محفوظ اور ان کی دسیسہ کاریوں سے مامون رہا۔

دَورِ فاروقی میں

مذکورہ حالات میں اگرچہ کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوا تاہم وہ کیفیّت نہ رہی جو دَورِ صدیقی میں تھی۔ زمانۂ رسالت کے بُعد کے تناسب سے حالات میں ضرور کچھ تغیّر آیا، گو بوجوہ وہ زیادہ نمایاں نہ ہو سکا۔

دورِ عثمانی میں

عوامی اتحاد میں کسی حد تک رخنہ، دُنیاوی چیزوں میں ایک گونہ رغبت اور دینی و سیاسی مسائل کے نزاع میں قدرے شدّت ظہُور پذیر ہو گئی اور اجتہادی و سیاسی آراء میں حضرت عثمانؓ امکانِ خطا سے اپنے پیشروؤں۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح محفوظ نہ رہ سکے۔ سب سے بڑھ کر ملک و معاشرہ شرپسند عناصر اور سازشی گروہ کی

دسیسہ کاریوں سے غیر محفوظ ہو گیا۔

دورِ علیؓ میں

زمانہ رسالت کے مزید بُعد کی وجہ سے تغیّرات نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے اشاعتِ اسلام اور سلسلۂ جہاد منقطع ہو گیا۔

- دینی و سیاسی مسائل و آراء کے اختلاف میں پوری شدّت اُبھر آئی، جس کی نمایاں مثالیں جنگِ جمل و صفّین اور جنگِ نہروان ہے۔
- دنیا اور زخارفِ دنیا میں اضافہ اور اسی حساب سے فکرِ آخرت میں مزید کمی پیدا ہو گئی۔
- حضرت علیؓ اپنے اجتہادات اور سیاسی تدابیر میں اُس حد تک غیر محفوظ نہ رہے جو ان کے پیش رو خلفاء رہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تاریخِ اسلام جمل و صفّین جیسے واقعات سے خالی رہتی۔

دورِ معاویہؓ میں

نظمِ حکومت اور عام معاشرے میں دینی گرفت پچھلے ادوار کی نسبت کچھ ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور نبوّت کے عظیم روحانی اثرات بتدریج کم ہوتے نظر آتے ہیں وھلمّ جرّاً حضرتِ معاویہؓ کے عہدِ اقتدار سنہ ۶۰ھ تک، سیاسی اعتبار سے صحابہ کرامؓ کی حکمرانی کا دور ہے یعنی جس میں حکمرانِ اعلیٰ (خلیفہ) نہ صرف کوئی نہ کوئی صحابی ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی اعتبار سے دیگر اصحابِ رسول میں ممتاز اور خصوصی صفات کا حامل ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ جلیل القدر حضرات، اسلامی معاشرے میں پیدا ہونے ہوئے بگاڑ کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ دراں حالیکہ صحابۂ کرام سے بڑھ کر اصلاح اور بگاڑ کو روکنے کا جذبۂ صادقہ اور کسی میں نہیں ہوسکتا لیکن اس کے باوجود بگاڑ کے طبعی اور قدرتی اسباب کی بنا پر خود خلفائے راشدین (عثمانؓ و علیؓ) کے دور میں اسلام کے نظامِ اجتماعی میں بگاڑ کو در آنے کا موقع مل گیا۔

یہ بات مسلّم ہے کہ صحابۂ کرام سیرت و کردار، مزاج و اطوار اور انتظامی و سیاسی صلاحیتوں میں باہم متفاوت تھے، اس اعتبار سے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے سیرت و کردار کی جس پختگی اور سیاسی و انتظامی معاملات میں جس بیدار مغزی کا ثبوت دیا۔ عثمانؓ و معاویہؓ ہوں یا حضرت علیؓ ان میں ہمیں اس کا سُراغ نہیں ملتا۔ لیکن ایک چیز ہمیں تسلیم کرنی چاہیئے کہ معروف کی اشاعت، منکر کا استیصال اور بگاڑ کو روکنے کا جذبۂ بے پایاں ان تمام حضرات میں بالخصوص اور دیگر اصحابِ رسولؐ میں بالعموم ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے خاکسار کو یہ امر تسلیم کرنے میں سخت تامّل ہے کہ عثمانؓ و معاویہؓ نے عمداً ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہو جس سے بگاڑ کو تقویت پہنچی ہو یا جس سے اسلام کے تقاضے مجروح اور عوام کی حق تلفی ہوئی ہو۔

بنا بریں عمومی بگاڑ کے اسباب کا صحیح اور دیانت دارانہ تجزیہ یہ ہے کہ زمانۂ رسالت کے بُعد اور اس کے باطنی و روحانی فیوض و برکات میں بتدریج کمی کی وجہ سے بعض ایسے خارجی اسباب پیدا ہوگئے تھے جن سے بگاڑ کے عوامل کو اسلامی معاشرے میں کُھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ان میں سے چند اہم تر اسباب یہ تھے۔

اوّلاً خود اسلامی معاشرے کے مزاج میں آخرت کے مقابلے میں دنیاداری کا رجحان پیدا ہونا شروع ہوگیا۔

ثانیاً کثرتِ فتوحات کے باعث مال و دولت کی فراوانی جو بجائے خود بہت سے فتنوں اور حشر سامانیوں کا پیش خیمہ بن گئی۔

ثالثاً فتوحات ہی کے نتیجے میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے نومسلم و عجمی رعایا کی اسلامی قلمرو میں شامل ہوگئی جس نے اگرچہ زبان سے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا تھا لیکن ان کو اسلامی نہج پر اپنے افکارِ جاہلیت کی تطہیر اور سیرت و کردار کی تعمیر تربیت کے زیادہ مواقع میسّر نہ آئے تھے۔ اس بناء پر مسلمان ہونے کے باوجود اُن کے اندر اپنے اپنے علاقے، ماحول اور جاہلی تمدّن کی خوبو موجود رہی اور ان کی سن رسیدہ ہڈیوں میں رچے بسے غیر اسلامی اثرات بالکلیہ ختم نہ ہوسکے تھے۔

رابعاً اسلام کی بڑھتی طاقت کا جواب طاقت سے دینے کی کسی کے اندر جب سکت نہ رہی تو یہود و نصاریٰ کے ایک گروہ نے ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر سازش کا راستہ اختیار کرلیا اور نومسلم و عجمی رعایا میں سے کمزور عناصر کو اپنے ساتھ ملا کر اسلامی علاقوں میں داخلی انتشار برپا کرنے کی کوشش کی۔

خامساً نئے مسلمانوں کی اتنی عظیم تعداد کے مقابلے میں اسلامی حکومتوں کا وہ صحیح و خالص عنصر، جو شرفِ صحابیت سے بہرہ ور اور سیرت و کردار کی اعلیٰ خصوصیات کا حامل تھا، بہت کم رہ گیا تھا۔

یہ اور ان جیسے دیگر اسباب و عوامل، مذکورہ عظیم و جلیل اصحابِ رسولؐ کے اپنے عزائم کے بروئے کار لانے میں مزاحم ہوگئے۔ اور وہ بگاڑ کو روکنے میں کامیاب ہوسکے اور حالات و ظروف کے لحاظ سے وہ اس پر قادر بھی نہ تھے کہ بگاڑ کو بالکلیہ روک دیں۔ ان کا یہی کارنامہ ان کی عظمت کے لیے کافی ہے کہ انہوں نے بگاڑ کے اس قدرتی سیلاب کو روکنے اور اس کو کم کرنے کے لیے ممکنہ حد تک کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

فجزاهم الله احسن الجزاء ورضي الله عنهم ورضوا عنه۔

موجودہ دور کے بہت سے وہ افاضل جنہوں نے قرنِ اوّل کے حالات و واقعات پر خامہ فرسائی کی ہے، افسوس ہے کہ انہوں نے اس دور پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ بزرگ صحابیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بہت حد تک سطحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان حضرات کی اوّلین بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے تغیر کے اسباب و عوامل کی نشاندہی میں بالغ نظری سے کام نہیں لیا ہے، تغیر کے جو حقیقی عوامل اور طبعی اسباب تھے، انہیں تو نظر انداز کر دیا اور بگاڑ کا ایک خانہ ساز سبب ملوکیت کو بنایا اور اسی کو تمام برائیوں کا منبع و مصدر باور کرایا۔

دوسری غلطی ان حضرات کی یہ ہے کہ ان کے نقطۂ نظر سے بگاڑ صرف سیاست (نظامِ حکومت) میں آیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بگاڑ ہر شعبۂ زندگی میں اپنی تدریجی رفتار سے آیا ہے جس کے اثرات سیاست پر بھی پڑے، نہ یہ کہ دفعۃً نظامِ حکومت میں بگاڑ اس طرح آیا جس طرح ریل کی پٹری کا کانٹا بدلنے سے گاڑی کا رخ فوراً تبدیل ہو جاتا ہے۔

تیسری غلطی ان حضرات کی یہ ہے کہ انہوں نے جرم و سزا کے تناسب کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ حضرت عثمانؓ ہوں یا معاویہؓ یا اور دیگر خلفاء و ملوک، یہ سب آخر اسی مشتِ خاک سے بنے ہوئے انسان تھے جن کے خمیر میں خطا و نسیان کا مادہ شامل ہے۔ اس لئے ان سے کوتاہیاں ممکن تھیں۔ اور ان سے کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوئی بھی ہیں لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے جس انداز کی کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ اس کو اسی تناسب سے سزا کا مستحق اور مجرم گردانا جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ایک غلطی کی سزا سوئی کی چبھن ہو لیکن وہاں سوئی کی جگہ نشتر اس کے رگ و پے میں اتار دیئے جائیں، تعزیر کے مستحق مجرم کو حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔

معمولی کوتاہی کو خوفناک اور بھیانک انداز میں پیش کر کے اس کی واقعی قباحت کو ہزاروں گُنا بڑھا کر پیش کیا جائے، اجتہادی نوعیت کی غلطی کو اسلام کی تباہی و ہلاکت سے تعبیر کیا جائے اور اُن کی تمام خوبیوں اور کارناموں کو نظر انداز کر کے خوردبین کے ذریعے سے ان کے صرف کمزور پہلوؤں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سامنے لایا جائے بلکہ ان کی فردِ جُرم میں اپنی طرف سے بھی اضافے کر دیے جائیں۔

حضراتِ محترم! جب "ملوکیت" کو ہی فساد کا سب سے اہم سبب سمجھ لیا گیا تو اپنے اس نقطۂ نظر کے اثبات کے لیے ان حضرات نے یہ سارے ہی ظلم ہمارے بعض جلیل القدر بزرگوں پر ڈھائے ہیں۔ شاید کسی ایسے ہی موقعہ کے لیے کہا گیا تھا ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

— ۷ —

موجودہ حالات میں کیا

"جمہوریت" ہمارے لئے موزوں اور مناسب ہے؟

مجھے احساس ہے کہ مقالہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور یہ سمع خراشی شاید آپ میں سے بہت سوں کے تکدّرِ خاطر کا باعث ہو لیکن ابھی ایک نکتے پر گفتگو باقی ہے۔
میں چاہتا ہوں کہ اس پر بھی چند باتیں ہو ہی جائیں کہ ؎

امیر جمع ہیں احباب ، حالِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

تو حضراتِ محترم! میرے موضوع کا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ ہمارے دَور کے اکثر مفکرین نے مغربی جمہوریت کو اسلامی خلافت کا متبادل بلکہ نعم البدل سمجھ کر قبول اور اسے "اسلامی جمہوریت" کا عنوان دے کر مشرّف بہ اسلام کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں خلفائے راشدین کے انتخاب کو بھی جمہوری ثابت کرنے کے لئے حقائق و واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، راقم خاکسار کو اس سے بھی اختلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ساحرانِ مغرب نے "جمہوریت" کا صور اس زور سے پھونکا ہے کہ سارا عالم اس قتالہ کا والہ و شیدا اور اس کی زلفِ ادا

کے نزدیک بالعموم اور سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کے نزدیک بالخصوص ہمارے دکھوں کا واحد علاج قرار پائی ہے ۔ آہ ع نگاہ کی نامسلمانی سے فریاد
اقبالؒ نے بھی یہی ماتم کیا تھا ؎

واٸے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

میں مانتا ہوں کہ اسلام کا نظامِ خلافت مستبدانہ و آمرانہ نہیں بلکہ جمہوری مزاج کا حامل ہے لیکن اس جمہوری مزاج کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانِ اعلیٰ بھی تنقید اور محاسبے سے بالا نہیں اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی پر اُسے بھی ٹوکا اور روکا جاسکتا ہے ، وہ قانون سے بالاتر نہیں ، اگر وہ بھی قانون شکنی کا ارتکاب کریگا تو ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کو عدالت کے کٹہرے میں لے جائے ۔ وہ اہل الرائے اصحاب کے مشورے اور رائے کا پابند ہے اور عام حالات میں ان سے تجاوز کرنا اس کے لیے مناسب نہیں لیکن اس جمہوریت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے جو آج بیشتر اسلامی ملکوں میں رائج ہے ۔ اسلام میں منکرات کی اشاعت کی قطعاً اجازت نہیں ہے جبکہ مغربی جمہوریت کی ساری بنیاد منکرات کی اشاعتِ عام اور اجازتِ عام پر قائم ہے ۔ جیساکہ گزشتہ سطور میں وضاحت کی گئی ہے ۔

اس لیے مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں اور اسلامی تہذیب نظام اسلامی ملکوں میں جاری وساری ہو تو اس کے بغیر چارہ نہیں کہ ہم مغربی جمہوریت سے ناطہ توڑ کر اپنے حالات کے مطابق ایسا طرزِ انتخاب اختیار کریں جو مغربی طرزِ انتخاب سے مختلف ہو جس میں بندوں کو گِنا جاتا ہے ، تولا نہیں جاتا ۔ ہمارے لیے موزوں طریقۂ انتخاب وہی ہے جس میں بندوں کو تولا جائے ، گِنا نہ جائے ۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

گیا اور مسلمانوں کی قوت و طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔

اِس اِدارۂ خلافت کے خاتمے کے بعد ترکی سمیت مختلف اسلامی ملکوں میں جمہوری نظام نافذ ہُوا جس سے اوّلاً اسلامی ملکوں میں سیکولر ذہن پیدا ہوا۔ پھر رواداری اور عوامی حقوق کے نام پر ہر قسم کے نظریے کے پرچار اور اشاعت کی کُھلے بندوں اجازت دی گئی، جس سے تصلّبِ دینی کی بجائے دین میں مُداہنت کا روگ عام ہوا۔ اسلامی احکام سے غفلت، شعائرِ اسلام سے بیگانگی اور اسلامی تہذیب و تمدّن سے نفرت، مسلمانوں کی نسلِ نو کا شعار قرار پایا اور مغربی تہذیب کی برتری کا نقش ذہنوں میں قائم ہُوا۔ اور اب معاملہ ذہنی ارتداد اور اسلام سے عملی بغاوت تک پہنچ گیا ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک کو دیکھ لیجیے کہ بجز سعودی عرب کہیں بھی اسلامی قانون کی عملداری نہیں ہے بلکہ ہر جگہ مغربی جمہوریت اور مغربی نظام قائم ہے، عدالتیں مغربی قوانین کے تحت فیصلے کرتی ہیں۔ مغرب کا سُودی نظام اسلامی ملکوں کی معیشت کی بُنیاد ہے۔ حتیٰ کہ مخلوط تعلیم تک کی لعنت اسلامی ملکوں میں موجود ہے۔ حکومتوں کی تمام پالیسیوں اور اقدامات میں مغربی ذہن کی کارفرمائی ہے۔ الغرض زبان سے لے کر لباس تک معاشرت سے لے کر سیاست تک اور ذہن و فکر سے لے کر طرزِ بُود و باش تک ہماری نسلِ نو کی اکثریت مغربی سانچے میں ڈھل چکی ہے، اعتقادات کی بنیاد کھوکھلی ہے اور ایمان کی عمارت متزلزل اور عمل کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

یہ نتیجہ ہے مغربی نظام و تہذیب کی اُس برتری کا جو مغربی استعمار کے راستے سے اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور جمہوریت کے ذریعے سے جسے استحکام نصیب ہُوا۔ کیونکہ ہمارے اسلامی ملکوں کی لیڈرشپ ذہناً اُس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جو کارگہِ مغرب کے تیار کردہ ہیں، اس لیے انہوں نے چاہے اپنے مخصوص مفادات کے

پیش نظر جمہوری نظام کو صحیح معنوں میں قائم نہ ہونے دیا ہو لیکن جمہوری نظام میں تخریبی عوامل کو کھل کھیلنے کا جو موقع ملتا ہے، وہ انہوں نے ضرور مُہیّا کیا، جمہوریت کی بعض مُسلّمہ قدروں کو اپنانے سے چاہے گریز کیا ہو لیکن مغرب کے جمہوری نظام میں نظریاتی انتشار اور فکری و اخلاقی انارکی پھیلانے کی جو گنجائش ہے، اس کے اسباب زیادہ سے زیادہ مُہیّا کئے۔ مغرب کے جمہوری نظام میں جو کچھ خوبیاں ہیں۔ ان سے اگرچہ ہمارے حکمراں گریزاں ہی رہے لیکن اس کے نام پر معاشی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال کی حوصلہ افزائی ہی کی ہے نتیجتہً ہر اسلامی ملک قولاً نہ سہی عملاً اسلامی تہذیب کو خیر باد کہہ چکا ہے اور مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر کو اپنانے کا شوق فراواں جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے، نسلِ نو نظریاتی ژولیدگی اور فکری انارکی میں مُبتلا ہے۔ اور ایک طبقہ سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے ردِّ عمل میں سوشلسٹ نظریات کا گرویدہ نظر آتا ہے اور بعض اسلامی ریاستیں تو سوشلسٹ نظریات پر ہی قائم ہیں تاہم اباحیت و زندقہ اور اسلامی تہذیب و شعائر سے بیگانگی و بغاوت کا رُجحان ان سوشلسٹ ریاستوں میں بھی روز افزوں ہے۔

ہر اسلامی ملک ایک عجیب کش مکش میں مُبتلا ہے اور گو مگو کی کیفیت سے دوچار ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عوام میں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ اسلامی تربیت و کردار سے بھی وہ محروم ہیں اور حکمران طبقہ اپنے مفادات کے گنبد میں محصور عوام کی فکری و اخلاقی تربیت کے فریضے سے یکسر غافل۔ سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کی تگ و دو کا محور بھی مخصوص مفادات کی حفاظت اور جماعتی و ذاتی مقاصد کے حصول تک محدود ہے ان حالات کے باوجود ہم نے "جمہوریت" کو اس معنی میں اپنایا ہوا ہے کہ

ہر شخص اور جماعت کو اپنے نظریات کے پرچار کی اجازت ہے کہ وہ نسلِ نو کو جس طرح چاہے گمراہ کرے، صحافت کو اور دیگر ذرائع ابلاغ کو مادر پدر آزادی حاصل ہے کہ وہ گھر گھر عریانی و فحاشی کا سیلاب پہنچا دیں۔ سرمایہ داروں کو یہ عام اجازت ہے کہ وہ اپنے سرمائے کے بل پر جس طرح چاہیں عوام کا خون چوسیں، مزدوروں کا استحصال کریں اور گرانی میں اضافہ اور بے ہودہ مصنوعات کے ذریعے سے عوام کا اخلاق تباہ کریں اور پھر اس سرمائے سے شاہد و شراب کی محفلیں جمائیں، ناچ گھروں اور کلبوں کی رونقیں بڑھائیں اور جنون و سرمستی کا ناٹک عام رچائیں۔ ادب و دانش کے گہواروں اور تعلیم و تربیت کے اداروں میں اسلام دشمنوں کو یہ اذنِ عام حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کے ناپختہ ذہنوں میں غیر ملکی نظریات کی آبیاری کریں اور انہیں اسلام سے متنفر اور بیزار کریں۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ "جمہوریت" کا یہی مفہوم ہم نے سمجھا ہوا ہے اور کیا جمہوریت کی یہ حشر سامانیاں ہم میں سے ہر شخص کے تجربہ و مشاہدے کا حصہ نہیں ہے؟ پھر بحالاتِ موجودہ "جمہوریت" ہمارے دکھوں کا علاج، ہمارے درد کا درمان اور ہمارے مسائل کا حل ہے؟ یا ہمارے لیے زہر ہلاہل، موت کا پیالہ اور ہماری تہذیب و ثقافت اور ہمارے دین و مذہب کے لیے خودکشی کا سامان ہے۔ آہ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

جس جمہوریت نے ہمیں اپنی تہذیب و ثقافت سے محروم کیا۔ ہمیں احکامِ اسلام و شعائرِ دین سے بیگانہ بنایا اور ہماری اسلامی وحدت و مرکزیت کو پارہ پارہ کیا۔ آہ کتنی رُلا دینے والی یہ حقیقت ہے کہ وہی جمہوریت آج ہمارے بہت سے اہلِ علم

کے نزدیک بالعموم اور سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کے نزدیک بالخصوص ہمارے دکھوں کا واحد علاج قرار پائی ہے۔ آہ ع نگاہ کی نامسلمانی سے فریاد اقبال رح نے بھی یہی ماتم کیا تھا ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

میں مانتا ہوں کہ اسلام کا نظامِ خلافت مستبدانہ و آمرانہ نہیں بلکہ جمہوری مزاج کا حامل ہے لیکن اس جمہوری مزاج کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانِ اعلیٰ بھی تنقید اور محاسبے سے بالا نہیں اور قرآن و حدیث کی خلاف ورزی پر اسے بھی ٹوکا اور روکا جا سکتا ہے، وہ قانون سے بالاتر نہیں، اگر وہ بھی قانون شکنی کا ارتکاب کریگا تو ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کو عدالت کے کٹہرے میں لے جائے۔ وہ اہل الرائے اصحاب کے مشورے اور رائے کا پابند ہے اور عام حالات میں ان سے تجاوز کرنا اس کے لیے مناسب نہیں لیکن اس جمہوریت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے جو آج بیشتر اسلامی ملکوں میں رائج ہے۔ اسلام میں منکرات کی اشاعت کی قطعاً اجازت نہیں ہے جبکہ مغربی جمہوریت کی ساری بنیاد منکرات کی اشاعتِ عام اور اجازتِ عام پر قائم ہے۔ جیساکہ گزشتہ سطور میں وضاحت کی گئی ہے۔

اس لیے مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں اور اسلامی تہذیب نظامِ اسلامی ملکوں میں جاری و ساری ہو تو اس کے بغیر چارہ نہیں کہ ہم مغربی جمہوریت سے ناطہ توڑ کر اپنے حالات کے مطابق ایسا طرزِ انتخاب اختیار کریں جو مغربی طرزِ انتخاب سے مختلف ہو جس میں بندوں کو گنا جاتا ہے، تولا نہیں جاتا۔ ہمارے لیے موزوں طریقۂ انتخاب وہی ہے جس میں بندوں کو تولا جائے، گنا نہ جائے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

ایسے مناسب اور معقول طریقۂ انتخاب کی تفصیلات اہل علم و فکر طے کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو ہماری راہ میں جہد و سعی کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنی راہیں کھول دیتے ہیں" بلکہ اگر ہو سکے تو جس ادارۂ خلافت کو شوقِ جمہوریت میں ختم کر دیا گیا اس کا احیاء عمل میں لایا جائے کہ وہ ادارۂ خلافت ہی ہماری قوت و طاقت کا منبع تھا اور ہماری تہذیب و ثقافت اور دین و مذہب کا امین و پاسبان بھی ہے

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

ورنہ ہم جس طرف جا رہے ہیں اور جمہوریت کو جس انداز سے ہم نے اپنایا ہے اور الگ الگ ریاستوں اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو جس طرح ہم نے بہ رضا و رغبت اور ضمیر کی ادنیٰ سی خلش کے بغیر قبول کر لیا ہے، اس کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا ہے ہے

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
ایں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

— ۸ —

موجودہ ملکی حالات سے متعلّق چند باتیں

حضراتِ محترم! اگر اجازت ہو تو چند باتیں موجودہ ملکی حالات کے متعلّق بھی عرض کروں۔

ہمارے ملک کے سیاسی حالات آج کل پھر سخت دگرگوں ہیں۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ سیاسی طور پر ہمارے ملک کو اطمینان و استحکام کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ جب بھی انتقالِ اقتدار کا کوئی مرحلہ آیا ہے تو عوام کے ایک طبقے نے سکھ کا سانس لیا ہے اور نئے صاحب اقتدار سے توقعات کے پُل باندھے اور اُمیدوں کے شیش محل قائم کئے لیکن مرورِ ایّام کے ساتھ توقعات کے پُل ڈھے چلے گئے۔ اور اُمیدوں کے شیش محل چکنا چُور ہو گئے۔ کیونکہ ہر آنے والے حکمران نے باتیں تو بڑی اچھی اچھی کیں، حسین وعدے کئے۔ اُمیدوں کے سبز باغ دکھائے۔ مسائل حل کرنے کا عزم بالجزم ظاہر کیا اور علی الخصوص اسلامی نظام کے قیام کو اپنا مقصد و محور باور کرایا۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سب وعدے سراب ثابت ہوتے رہے، عوام کے مسائل حل ہونے کی بجائے مزید اُلجھتے چلے گئے اور حالات سنگین سے سنگین تر۔ اعلانات اسلامی نظام کے قیام کے ہوتے رہے لیکن اقدامات اور پالیسیاں سب اسلام کے خلاف۔ جن سے ملک اور افراد قوم بڑی تیزی سے اسلامی اقدار و تہذیب سے بیگانہ اور دُور ہوتے چلے گئے۔

صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے متعلّق تو لوگوں کا پختہ خیال تھا کہ یہ شخص ضرور اپنے پیشرو حکمرانوں سے مختلف اور قول و عمل کے تضاد سے پاک ہوگا

اور کچھ سنہری کارنامے سرانجام دے گا لیکن افسوس ہے کہ صدرِ محترم جناب جنرل ضیاء الحق کے ذاتی کردار، شرافت و حلم اور تواضع و فروتنی کا اعتراف کرتے ہوئے جہاں تک ملکی مسائل، عوامی مشکلات اور اسلامی نظام کے قیام کا تعلق ہے۔ یہ دَور بھی سخت ناکام رہا ہے اور ایک مُبصّر کو بجا طور پر کہنا پڑتا ہے ؏

اب کے بھی دن بہار کے یُوں ہی گزر گئے

چنانچہ عوام اب پھر سخت مضطرب، پریشان اور سرکاری اداروں اور اہلکاروں سے سخت نالاں ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ گرانی کا منہ زور گھوڑا بالکل بے لگام ہو گیا ہے، جرائم میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ رشوت کے بغیر کسی کام کا تصوّر بھی ممکن نہیں، بے حیائی کا ایک طوفان ہے جو اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ اور بے دینی کا ایک سیلاب ہے جو تمام بندوں کو توڑ کر ہمارے گھروں کے اندر گھس آیا ہے۔

عوام کے اضطراب اور پریشانی کی وجہ انتخابات کا عدم انعقاد نہیں، عوام اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ انتخابات مسائل کا حل نہیں (جیسا کہ اہلِ سیاست یہ تاثر دیتے ہیں) بلکہ انتخابات کے ساتھ بڑی تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ ہمارے ملک میں جب بھی عام انتخابات ہوئے ہیں، ملک ایک نئی اُفتاد ہی سے دوچار ہوا ہے۔ محبِّ وطن حلقوں میں اب بھی بجا طور پر یہ اندیشہ پایا جاتا ہے کہ اگر پھر انتخابات کا ڈول ڈالا گیا تو نہ معلوم اس کا کیا نتیجہ برآمد ہو؟

لیکن پھر یہ سوال ایک خوف ناک شکل میں سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کہ جب موجودہ حکومت بھی ناکام ہے اور انتخابات بھی مسائل کا حل نہیں تو پھر کیا کیا جائے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اہلِ دانش کی عقلیں حیران ہیں، دماغ ماؤف ہیں اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کم از کم راقم کی نظر میں موجودہ صورت حال ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی آئینہ دار ہے اور یہی وہ صورت ہے جس کی خبر ختمی مرتبت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک حدیث میں دی تھی۔ آپؐ نے فرمایا۔

یکون فی آخر الزمان رجال یختلون الدنیا بالدین یلبسون للناس جلود الضأن من اللین السنتھم احلی من العسل و قلوبھم قلوب الذئاب یقول اللہ تعالیٰ أبی تغترون ام علیّ تجترؤن فبی حلفت لابعثن علی اولئک منھم فتنۃ تدع الحلیم منھم حیران (ترمذی بحوالہ جمع الفوائد ج ۱ ص ۳۹)

کہ "جب ایسے لوگ ہو جائیں کہ نام دین کا لیں اور کام دنیاداری کے کریں، زبان کے بڑے میٹھے ہوں لیکن دل بھیڑیے کی طرح سخت ہوں، وہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہوں۔ اور اس کے حق میں جسارتوں کا ارتکاب کرتے ہوں تو ایسے موقعے پر اللہ تعالیٰ ایسے فتنے میں لوگوں کو مبتلا کر دیتا ہے کہ بڑے بڑے سمجھ دار لوگ بھی حیران رہ جاتے ہیں"

اس حدیث کی صداقت اس سے واضح ہے کہ مستقبل کے متوقع حکمران یعنی سیاستدان بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں، حالات کی اصلاح کے لیے کسی کے پاس کوئی معقول حل نہیں ہے۔ ایم آر ڈی میں اکثریت اُن سیاست دانوں کی ہے جن کے درمیان بنائے اتحاد ضیاء دشمنی ہے۔ اس میں اگرچہ بعض قابلِ احترام شخصیتیں بھی شامل ہیں لیکن وہ محض جمہوریت کے ہجر و فراق کے صدمے سے نڈھال ہو کر اس میں شامل ہو گئی ہیں جس سے خود ان کی شخصیت ہی مجروح ہوئی ہے۔ یہ ایم آر ڈی والے تحریک چلا رہے ہیں، لیکن ظاہر بات ہے کہ تحریک ایک تو روز روز نہیں چلتی۔ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قومی اتحاد کی تحریک کی طرح کوئی تحریک برپا کر سکتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ یہ عوام کے دیکھے بھالے لوگ ہیں، اس لیے اُمید نہیں کہ وہ عوام کی تائید و حمایت سے کوئی بڑی تحریک پیدا کر سکیں گے۔ دوسرے تحریک کے لیے ان کے پاس کوئی واضح مقاصد نہیں، جس سے تحریک میں جان پڑ سکے۔ اس لیے اس تحریک سے ملک میں انتشار مزید تو ہو سکتا ہے،

اصلاحِ احوال کی کوئی اُمید نہیں ۔جس طرح سندھ میں تخریبی عناصر اور ملک دشمن گروہ نے اس تحریک کی آڑ میں کیا ہے۔

مسلم لیگ (پگارہ گروپ) نے اذانوں کا سلسلہ شروع کیا ہے جو محض دین کے ساتھ ایک استہزاء و مذاق ہے۔ اوّل تو انتخابات کا عدمِ انعقاد کوئی مصیبت نہیں کہ جس کے لیے اذانیں دی جائیں اور انتخابات کی دیوی رام ہو جائے اور اگر موجودہ حکمرانوں کا کردار و عمل مصیبت سمجھا جائے، تب بھی مصیبت کے ازالے اور دفعیے کے لیے اگرچہ اذانیں دینے کا رواج عوام میں پایا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں ہے۔ ملک کی ایک انتہائی ذمہ دار پارٹی کی طرف سے ایسی بات کا اقدام، جس کا قرآن و حدیث میں کوئی ثبوت نہ ہو، بالکل نامناسب بات اور اس کے وقار کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں اس سے کسی خاص فائدے کی بھی اُمید نہیں نہ اس سے اصلاحِ احوال ہی کی صورت پیدا ہونے کا امکان ہے۔

محض اذانیں دینے کی بجائے اگر یہ کیا جائے کہ لوگ مسجدوں میں جا کر باجماعت نماز پڑھیں، اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوں، اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اللہ تعالےٰ سے اصلاحِ احوال کی دُعائیں کریں تو ہو سکتا ہے بلکہ یقین غالب ہے کہ قوم کی یہ اجتماعی تبدیلی (اللہ کی طرف رجُوع اور اپنے گناہوں کی معافی) اللہ کی رحمت کے نزول کا باعث بن جائے اور اللہ تعالےٰ اصلاحِ احوال کی صورت پیدا فرما دے ورنہ بظاہر تو اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انتخابات اگر ہوتے ہیں تو اصلاح کی بجائے حالات بدتر ہونے کا ہی امکان زیادہ غالب ہے اور موجودہ صورت بھی سخت اضطراب انگیز اور ع

توسے بہ میرد از بے یقینی

کی آئینہ دار ہے۔

اس لیے یہ وہی مقام ہے جہاں کوئی علاج نہیں سوجھتا، کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔ اہلِ سیاست ہوا میں تیر چلا رہے ہیں جس کا کوئی ہدف نہیں۔ یگارہ گروپ بانگیں دے رہا ہے جس سے مقصود اللہ کی طرف رجوع نہیں، محض سیاست کے ویرانے میں اپنے وجود کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ اور اہلِ اقتدار کے لیے، اقتدار گلے کی پھانس بن گیا ہے، نہ اُگل سکتے ہیں نہ نگل سکتے ہیں۔ یہ ہمہ مقتدر طبقہ اپنی جگہ پریشان ہے۔ انتخابات سے بھی وہ الرجک ہے اور برسرِ اقتدار رہنا بھی ان کے لئے مشکل تر۔ کیونکہ اس کے اقتدار کا پیریڈ منتخب حکمرانوں سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ کام کچھ نہیں کر رہا ہے، محض خوش کُن اعلانات اور دل فریب وعدوں سے وقت گزاری کر رہا ہے۔ آخر یہ بے مقصد حکمرانی، جس سے ملک کے مسائل سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں، کب تک چلے گی اور بلا جواز اس کو وہ کب تک طُول دیں گے؟

بنا بریں اس کا یہی واحد حل ہے کہ قوم کے اندر انابت الی اللہ کا جذبہ پیدا ہو، ہم نے من حیث القوم جو بدعملی اور معصیت کاری کا راستہ اختیار کیا ہوا ہے، اس سے قوم توبہ کرے اور من حیث القوم نیکی اور اطاعت الٰہی کا راستہ اختیار کرے۔ اپنے پچھلے گناہوں پر نادم اور پشیمان ہو۔ اور آئندہ سے ترکِ معصیت کا پختہ عزم کرلے۔ رو رو کر اور گڑگڑا کر اپنے رُوٹھے ہوئے رب کو منالے اور یہی وہ حل ہے جو آج سے ۱۴ سو سال قبل ہمارے آقا و سردار حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابُو الدرداءؓ سے مروی حدیثِ قدسی میں ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انّ اللہ تعالیٰ یقول اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا مالکُ الملوکِ وملکِ الملوک قلوب الملوک فی یدی وَ اِنَّ العِبَادَ اِذَا اَطَاعُوْنِی حَوَّلْتُ قلوب ملوکھم علیھم بالرّحمۃ والرأفۃ وان العبادَ اذا عَصَوْنِی حَوَّلْتُ قُلُوْبَھُمْ

بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا انفسكم بالدعاء على الملوك ولكن اشغلوا انفسكم بالذكر والتضرع كي اكفيكم۔ رواه ابونعیم فی الحلیۃ (مشکوٰۃ ج ۲، ص ۳۲۳)

حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا مالک۔ تمام بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں۔ جب بندے میری اطاعت کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کے اندر ان کے حق میں نرمی، شفقت اور محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہوں لیکن جب بندے میری نافرمانی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو عوام کے حق میں سخت اور منتقمانہ کر دیتا ہوں، پس وہ ظلم و جور کا بازار گرم کر کے عوام کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔

بنا بریں ایسے موقعوں پر بادشاہوں کو بددعائیں دینے کی بجائے اپنے آپ کی اصلاح کرو، اپنے کو میری (یعنی اللہ کی) یاد میں لگاؤ اور میری بارگاہ میں گڑگڑاؤ تاکہ میں تمہاری مشکلات میں تمہاری یاوری اور کفایت کروں"

ہماری زبان میں بھی ایک محاورہ ہے "جیسی رُوح، ویسے فرشتے" اسی طرح ایک عربی ضرب المثل ہے۔ اَعمالُکُم عُمّالُکُم۔ جس کو ایک فارسی مصرعے اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

افسوس ہے قدرت کے اس اٹل قانون کو ہم نے بالکل فراموش کر دیا ہے کہ ہم جو کچھ بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ ؎

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید، جو ز جو

بحیثیتِ مجموعی قوم اپنا رُخ بدلے

۴۶ سال سے ہمارا یہی معمول چلا آ رہا ہے کہ ہم حکمرانوں کو تو کوستے ہیں، بیوروکریسی کو تو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، سیاستدانوں کو تو مطعون کرتے ہیں، انتظامیہ اور پولیس کا تو رونا روتے ہیں۔ اسی طرح دیگر طبقات کو بُرا بھلا کہتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی شخص بھی اپنی اور اپنے دائرہ اثر کے افراد کی اصلاح کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب کوئی حکمران یا برسرِ اقتدار سیاسی جماعت ناکام ہو جاتی ہے تو ہماری سوچ صرف اسی بات تک محدود رہتی ہے کہ اب اس کی جگہ کسی اور شخص یا پارٹی کو برسرِ اقتدار آنا چاہیئے اور اسی نقطۂ نظر سے کوششیں ہوتی ہیں لیکن کوئی شخص اپنی سیرت و کردار کی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ بحیثیتِ مجموعی پُوری قوم روز افزوں اخلاقی زوال کا شکار ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں سوچتا کہ جب پوری قوم کا مزاج ہی بگڑ جائے، اخلاقی لحاظ سے وہ دیوالیہ ہو جائے اور امانت و دیانت اور راست بازی جیسے اوصافِ عالیہ اس سے ناپید ہو جائیں تو ایسی قوم سے صالح قیادت کیونکر پیدا ہوگی؟ صحیح انتظامیہ کہاں سے آئے گی؟ افسران اور وزراء کی زندگیاں خدا خوفی کی مظہر کیونکر ہوں گی؟ آخر حکمران افراد بھی تو اسی قوم کا فرد ہوگا جو اخلاق باختہ ہو چکی ہے۔ اس حکمران میں پھر سیرت و کردار کی خوبی کیوں کر ہوگی؟ انتظامیہ کے افراد بھی تو اسی قوم کے حصّہ ہوں گے جو امانت و دیانت سے عاری ہو چکی ہے۔ پھر امانت دار و دیانت دار

انتظامیہ کہاں سے آئے گی؟ افسران و وزراء بھی تو اسی قوم کے گوشت پوست کا حصہ ہیں جو عملاً دین و مذہب سے اپنا رشتہ توڑ چکی ہے اور فکری آوارگی اور نظریاتی انتشار میں مبتلا ہے تو ایسے افسران و وزراء سے سیرت و کردار کی رفعت و پاکیزگی اور ایمان و عقیدے کی پختگی کی اُمید کس بنیاد پر کی جاسکتی ہے؟۔

پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں صالح قیادت مُیسّر آئے، ہمیں نیک اور راست باز حکمران نصیب ہوں، انتظامیہ صحیح ہو، پولیس اور دیگر اہل کارانِ حکومت باکردار اور دیانت دار ہوں، ہمارے افسرانِ اعلیٰ، وزراء اور گورنران وغیرہ صحیح معنوں میں قوم کے خادم ہوں تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ پُوری قوم (بحیثیتِ مجموعی) اپنا رُخ بدلے، اپنا کردار صحیح کرے۔ امانت و دیانت کو اپنائے، مذہب اسلام کے اُصول و قوانین اور اس کے اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرے اور خدا اور رسول کی بغاوت کا وہ راستہ چھوڑ دے جس پر وہ گامزن ہے تو پھر حدیثِ مذکور کے مطابق اُمید ہے اللہ تعالےٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے گا، انشاء اللہ ہمارے مسائل حل ہوں گے اور ہمیں صحیح انتظامیہ اور صحیح قیادت نصیب ہوگی۔

لیکن اگر ہم نے سیرت و کردار کی اصلاح کا یہ راستہ اختیار نہ کیا اور اللہ و رسول کی اطاعت کا سچے دل سے عہد نہ کیا ہو تو یاد رکھئے لاکھ انتخابات ہوجائیں، نئے حکمران آجائیں، احتساب، مؤاخذے کے کیسے ہی ادارے قائم کردیئے جائیں اور دساتیر و قوانین کے انبار لگادیئے جائیں، ہمارے مسائل حل ہونے کی بجائے اُلجھتے ہی چلے جائیں گے، امن و سکون کی جگہ فساد و انتشار ہی میں اضافہ ہوگا، عدل و انصاف کی بجائے ظلم و جور ہی کی گرم بازاری ہوگی اور امانت و دیانت کی بجائے لوٹ کھسوٹ ہی کا سکہ رواں ہوگا۔

کاش ہم اس نکتے کو سمجھ سکیں اور اس کے مطابق عمل کی توفیق سے بہرہ ور

ہو سکیں۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۲۸ ستمبر ۱۹۸۳ء

ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام منعقدہ تیسرے مذاکرۂ ملی بعنوان
—— اسلامی ریاست کا تصور —— بتاریخ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ
بمقام کراچی پڑھا گیا

- جماعتِ اہلِ حدیث کی جماعتی لائبریری "سلفیہ لائبریری" کا اہتمام۔
- صحاح ستّہ وغیرہ کُتبِ حدیث کی عربی حواشی کے ساتھ طباعت۔
- کتبِ حدیث کے مستند اُردو تراجم و حواشی کی اشاعت۔
- جماعت اہلِ حدیث اور مسلک اہلِ حدیث سے متعلقہ ضرورت کے لٹریچر کی تیاری۔
- "فقہ محمدیہ" کے انداز پر ایسی کتاب کی ترتیب و طباعت جو صحیح مسائلِ حدیثیہ پر مشتمل ہو
- خواتین کے لیے دینی مسائل کی ایک مُستند کتاب۔
- ایک دارالافتاء کا قیام اور اس کے لیے ایک مستقل صاحبِ علم کی تقرری
  اور دیگر اسی انداز کے علمی منصوبے۔
- حفظ و ناظرہ قرآن مجید کے لیے جاری مدرسہ مصباح القرآن کی کفالت۔
- جماعت اہلِ حدیث کے قدیم اور مقبول ہفت روزہ "الاعتصام" کی سرپرستی
- اس محلہ کی واحد مسجد اہلِ حدیث کا انتظام و انصرام۔